اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔
ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غُنچے وہیں کِھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

قسط:12

''ہاں، میں سائیں مٹھا۔'' اس نے ثمر حیات کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی زہریلے سانپ کی سی چمک تھی اور اس کی نظریں جیسے ثمر حیات کے وجود میں کھبی جا رہی تھیں۔

''کیسے ہو دادا! میں تو سمجھا تھا کہیں مر کھپ چکے ہو۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ثمر حیات ہونٹ بھینچے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے تلاطم بپا تھے، طوفان اٹھ رہے تھے۔ اس کے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جسے وہ زندگی میں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور اس نے بارہا دعا کی تھی کہ وہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے ورنہ اسے ڈر تھا کہ وہ کہیں فرحی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ توڑ نہ دے۔ وہ وعدہ جو اس نے مرتے دم اس سے لیا تھا لیکن آج اتنے سالوں بعد وہ پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے خون میں ابال اٹھ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اس نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

''سائیں مٹھا اپنے دشمن کو قبر تک نہیں چھوڑتا دادا، تم خوش قسمت تھے جو تب بچ گئے تھے لیکن تقدیر پھر تمہیں آج میرے سامنے لے آئی ہے تو شاید اس بار تم اتنے خوش قسمت ثابت نہ ہو سکو۔'' وہ عجیب طرح سے ہنسا بالی جو سیمو کو سہارا دیے ثمر حیات کے پیچھے ہی آ رہا تھا یک دم اس نے سیمو کے بازو سے ہاتھ ہٹایا اور چیتے کی سی پھرتی سے چلتا ہوا ثمر حیات کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بے اختیار اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے کھلے ڈلے کرتے کی جیب میں ڈالا تو سائیں مٹھا کے ہونٹوں پر بکھری طنزیہ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے رخ موڑ کر اپنے پیچھے موجود گارڈز کی طرف دیکھا جن کے ہاتھ اپنی گنوں پر تھے اور پھر مڑ کر بالی سے مخاطب ہوا۔

''لڑکے اپنا کھلونا جیب میں ہی رہنے دو پھر کسی موقع پر اپنی حسرت پوری کر لینا۔'' اور پھر ثمر حیات کی طرف دیکھا۔

''اسی شہر کراچی میں رہتے ہو دادا تو پھر ملاقات تو ہوتی رہے گی تب پچھلے حساب دیکھیں گے اور سارے کھاتے کھولیں گے۔ قدرت اگر آج اتنے سالوں بعد تمہیں سامنے لائی ہے تو پھر بھی ضرور لائے گی.. کیوں دادا؟''

ثمر حیات خاموش کھڑا فرحی کے ساتھ کیے اس آخری وعدے کو دل ہی دل میں دُہرا رہا تھا۔

''آج اگر کچھ دیر بعد میری بیوی کا یہاں اس کلینک میں آپریشن نہ ہوتا تو آج ہی دو، دو ہاتھ کر لیتے لیکن تم بہت غلط وقت پر سامنے آئے ہو۔ دادا تمہاری قسمت......''

''مٹھا سائیں۔'' ایک ملازم نما شخص گارڈز کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا اور تقریباً آدھا جھک گیا تھا۔

''بولو۔'' سائیں مٹھا اب اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بی بی پوچھ رہی ہیں وہ ابھی گاڑی میں ہی بیٹھیں یا......''

''انہیں لے آؤ۔'' سائیں مٹھا نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

''جی سائیں۔'' ملازم یوں ہی جھکے، جھکے بولا تھا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے چند الٹے قدم چل کر مڑا تھا۔ ثمر حیات کی نظریں اب ملازم پر تھیں جو گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ بی ایم ڈبلیو تھی اور اس کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی جس کے دروازے سے ٹیک لگائے ایک اور گارڈ گن ہاتھ میں اٹھائے کھڑا اِدھر اُدھر متجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا، وہ کچھ دیر یونہی گارڈ کی طرف دیکھتا رہا۔ بی ایم ڈبلیو سے اترنے والی خاتون بڑی سی سفید چادر لپیٹے ایک ملازمہ کے سہارے ہولے، ہولے چلتی ہوئی کلینک کی طرف آ رہی تھی۔ بے حد مضطرب سا ہو کر اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے ریوالور پر پڑا تھا جو قمیص کے نیچے چھپا ہوا تھا اور ایک لمحے کو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اپنے ریوالور کی ساری گولیاں سامنے ہولے، ہولے قدم دھرتی کلینک کی طرف آتی عورت کے سینے میں اتار دے اور اپنے سینے میں جلتی آگ کو ٹھنڈا کر لے...... وہ آگ جو کئی برسوں سے اس کے اندر جل رہی تھی، دہک رہی تھی، خون کا بدلہ خون...... لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھ اٹھا لیا۔ کاش فرحی نے جاتے، جاتے اسے وعدے کی اس زنجیر میں نہ باندھا ہوتا تو آج...... ایک گہری سانس لے کر اس نے سائیں مٹھا کی طرف دیکھا۔ اپنی بند مٹھیاں کھولیں لیکن اس کے اندر جھکڑ چل رہے تھے آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔

''ہوں تو دادا پھر ملاقات ہو گی اور یاد رکھنا سائیں مٹھا اپنی بے عزتی نہیں بھولا نہ بھولے گا آج اگر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک نفرت بھری نظر ثمر حیات پر ڈالی اور خاتون کا ہاتھ پکڑ کر کلینک کی طرف بڑھ گیا۔ ثمر حیات ہونٹ بھینچے اپنے اندر اٹھتے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جب بالی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''باس یہ تو سکندر سومرو ہے ایم پی اے۔'' اس نے چونک کر بالی کی طرف دیکھا لیکن اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ آخری بار جب وہ سائیں مٹھا سے ملا تھا تو صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک بگڑا ہوا جاگیر دار ہے اور اب بالی جو کہہ رہا تھا یقیناً ایسا ہی ہو گا ہماری سیاست آخر ایسے ہی لوگوں سے تو بھری ہوئی ہے۔

''چلیں باس۔'' بالی نے اسے پھر مخاطب کیا۔

''سیمو کو گھر چھوڑ کر پھر ہمیں ولسن صاحب کی طرف جانا ہے یہ لوگ وقت کے بہت پابند ہوتے ہیں باس۔''

اس نے خالی، خالی نظروں سے بالی کی طرف دیکھا اور پھر سر جھٹک کر گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے...... اپنے اندر اٹھتے طوفان سے لڑتے ہوئے اس نے گاڑی پارکنگ سے باہر نکالی تھی اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی تینوں گارڈ بہت عجلت سے بی ایم ڈبلیو کے پیچھے کھڑی گاڑی میں سوار ہوئے تھے اور بہت احتیاط سے اس کی گاڑی کے پیچھے آ رہے تھے۔

☆☆☆

ارتفاع ٹانگیں پھیلائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بہت ایزی موڈ میں ٹی وی دیکھ رہی تھی جب افنان ہاتھ میں فائل اٹھائے اپنے کمرے سے نکلا اور اسے لاؤنج میں اطمینان سے براجمان دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔

''ہے...... رتی تم نے یونیورسٹی نہیں جانا؟''

''نہیں۔'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پاس پڑا ریموٹ اٹھا کر چینل چینج کیا۔

''کیوں؟'' افنان نے بغور اسے دیکھا۔

''بس موڈ نہیں۔''

''تم کل بھی نہیں گئی تھیں... کیا بات ہے؟'' اب کے افنان کے لہجے میں تشویش تھی۔

''بس ویسے ہی موڈ نہیں ہو رہا ان دنوں۔'' اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں اب بھلا وہ افنان بھائی کو کیا بتاتی کہ وہ یونیورسٹی کیوں نہیں جا رہی اور اس کے دل میں کیا خوف ہے۔ افنان کو تو صرف کل کا پتا تھا اور وہ پچھلے چار دنوں سے یونیورسٹی نہیں جا رہی تھی۔ ایمل سے تو اس نے بہانہ کر دیا تھا کہ ان دنوں کچھ خاص پڑھائی نہیں ہو رہی اور وہ گھر میں رہ کر زیادہ اچھی طرح سے پڑھ سکتی ہے لیکن افنان بھائی کو ٹالنا آسان نہیں تھا۔

''لیکن تم تو اپنی اسٹڈیز کے متعلق بہت کونشس رہتی ہو۔ تم لاہور بھی زیادہ دن اسی وجہ سے نہیں رکیں۔''

''ہاں، لیکن ان دنوں دل اچاٹ سا ہو رہا ہے پڑھائی سے۔'' غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے نکلا تو افنان نے تاسف سے کہا۔

''لیکن رتی ان دنوں تو بہت اہم لیکچرز ہوں گے تمہارے، اب جبکہ ایگزام نزدیک ہے تو تمہیں اپنے لیکچرز مس نہیں کرنے چاہئیں۔'' افنان کے انداز میں فکر بھی تھی اور تنبیہ بھی۔ اس نے صرف سر ہلایا تھا۔

''کہیں عالیہ سے ناراضی تو نہیں چل رہی؟'' افنان نے کچھ سوچتے ہوئے اندازہ لگایا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اس کی بات کی تردید نہیں کی تھی۔

"یعنی میرا اندازہ درست ہے کہ دونوں دوستوں میں لڑائی ہوگئی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "بہتر ہے اسے منالو بسٹر بجائے اس کے کہ اپنی پڑھائی کا نقصان کرو۔" اس نے اس کا سر تھپتھپایا۔ "ویسے تم انتہائی بے وقوف ہو رتی بھلا دوست کی ناراضی پر کوئی پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتا ہے۔ میں واپس آکر عالیہ کو فون کرتا ہوں۔"

"ارے نہیں۔" اس نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ "ہماری صلح ہوگئی ہے اور میں کل سے یونیورسٹی جارہی ہوں۔" وہ مسکرائی وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ عالیہ کو فون کرے۔

"گڈ۔" افنان بھی مسکرادیا لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہوگیا۔ "زندگی بہت مشکل ہے رتی اور تم چھوٹی، چھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرتی ہو اور ان کا اثر لیتی ہو۔ بہادر بنو، کیا خبر آئندہ زندگی میں کوئی مشکل مقام آجائے اور تم ہمت ہار دو۔" وہ اس سے چھوٹا تھا لیکن اس سے زیادہ سمجھدار تھا اور یہ صرف آج کی بات نہیں تھی بلکہ وہ ہمیشہ سے ہی ایسا تھا اور اسے چھوٹی، چھوٹی نصیحتیں کرتا رہتا تھا۔ اس نے محبت سے افنان کی طرف دیکھا۔

"تمہاری نصیحت کا شکریہ افی! آئندہ کوشش کروں گی کہ چھوٹی، چھوٹی باتوں کا اثر نہ لوں۔" وہ زبردستی مسکرائی اور افنان نے آنکھیں پھیلا کر کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ کم از کم وہ ارتقاع سے اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا کہ نہ صرف یہ کہ وہ اس کی بات اتنے آرام سے سن لے گی بلکہ اس کا شکریہ بھی ادا کرے گی۔

"یہ تم ہی ہو ناں رتی، مجھے یقین نہیں آرہا۔" اس نے ایک شرارت بھری نظر اس پر ڈالی اور ایک بار پھر اس کا سر تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

"یہ چھوٹی سی بات کہاں تھی افی۔" اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ "اگر تم جان لو تو پتا نہیں تمہارا ردِعمل کیا ہو؟" وہ تو جب بھی ان لمحوں کے متعلق سوچتی تھی اس پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ اگر اس رات وہ ظفری کے چنگل سے نہ نکل پاتی، اگر رواحہ کی گاڑی اتفاق سے وہاں نہ آتی تو......؟ اس نے جھرجھری سی لی۔

کیا سمجھا تھا اس نے ظفری کو اور وہ کیا نکلا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے ظفری سے محبت تھی لیکن وہ اسے اپنا اچھا دوست سمجھتی تھی۔ عالیہ نے ہی پہلی بار اسے ظفری سے متعارف کروایا تھا اور وہ ہمیشہ ہی ظفری کی تعریف کرتی تھی شاید وہ بھی نہیں جانتی ہوگی کہ ظفری درحقیقت کیا ہے اور رواحہ اس کے لیے محض ایک کلاس فیلو تھا۔ اس نے کبھی رواحہ کی طرف غور سے نہیں دیکھا تھا کبھی اس کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ ایک بار عالیہ نے کہا تھا کہ رواحہ اسے پسند کرتا ہے شاید لیکن چند روز بعد ہی عالیہ کی بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ رواحہ خوش شکل، ذہین اور مہذب تھا۔ جواد، شہاب اور عظام کے متعلق بھی وہ یہی رائے رکھتی تھی لیکن اب رواحہ کے متعلق یکا یک اس کے احساسات بدل گئے تھے۔ کیا یوں اس طرح اچانک بھی احساسات بدل جایا کرتے ہیں یا اس کے دل میں کہیں کوئی چور گوشہ پہلے سے ہی موجود تھا؟

وہ حیران تھی ان پچھلے چار دنوں میں اس نے رواحہ کو بہت سوچا تھا اور رواحہ اسے دوسروں سے بہت مختلف لگا تھا۔ اس کا بہت جی چاہا تھا کہ وہ رواحہ سے ملے، اس کے متعلق مزید جانے۔ اس سے اس کے متعلق، اس کے خاندان کے متعلق پوچھے لیکن یونیورسٹی جانے کے خیال سے ہی اس پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ وہاں یونیورسٹی میں ظفری بھی ہوگا۔ وہ کیسے اس کا سامنا کرے گی اور اگر اس نے وہاں اسے مخاطب کرلیا۔ وہاں سب کے سامنے کچھ کہہ دیا کوئی غلط بات، کچھ ایسا کہ وہ سر اٹھانے کے قابل ہی نہ رہے اور کیا پتا اس نے وہاں یونیورسٹی میں ذکر کردیا ہو کسی سے۔ اپنے دوستوں سے ہی کہ اس نے مجھے بلایا تھا اور میں اس کے گھر چلی گئی تھی۔ کوئی الٹی سیدھی کہانی سنادی ہو۔ عالیہ نے بھی تو ان چار دنوں میں اسے فون نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کیا کہا ہوگا اس نے عالیہ کو۔

"نہیں، میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی۔" وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے بظاہر مطمئن ہوگئی تھی لیکن اندر سے

بے حد مضطرب اور بے چین تھی۔ پاپا تو خیر اس کی ہر بات مان لیتے لیکن ماما اور افنان ضرور اعتراض کریں گے بلکہ افنان تو خفا ہو جائے گا۔ ابھی تو خیر اس نے اسے ٹال دیا تھا لیکن پھر بعد میں کیسے اسے اور ماما کو قائل کرے گی۔

"اگر سب سچ بتادوں تو افنان تو غصے سے پاگل ہو جائے گا۔ ظفری کو مارنے پر تل جائے گا۔ نہیں میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی...... کبھی نہیں۔" اس نے جیسے اپنے فیصلے پر تصدیق کی مہر لگائی۔

"لیکن رواحہ......" دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔ "اگر میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی تو پھر رواحہ سے بھی نہیں مل سکوں گی...... تو کیا ہوا کیا فرق پڑتا ہے وہ محض ایک کلاس فیلو ہی تو ہے...... لیکن کیا وہ واقعی صرف ایک کلاس فیلو ہے؟" اس نے خود سے پوچھا اور اس کے دل میں ہوتی خوشگوار دھڑکنوں نے اس کی تردید کی تو وہ افسردہ سی ہو کر ٹی وی دیکھنے لگی تب ہی پاس پڑے اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی کسی کا فون آرہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی فون کی طرف دیکھتی رہی۔ فون سائلنٹ پر تھا اور نمبر اجنبی لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے فون اٹھا کر آن کیا۔

"ہیلو...... ارتقاع سے بات کرنی ہے۔"

"جی، میں ارتقاع ہوں۔"

"میں رواحہ ہوں۔" دوسری طرف سے رواحہ نے کہا تو اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ "کیسی ہیں آپ اور یونیورسٹی کیوں نہیں آرہی ہیں؟"

"وہ دراصل......" وہ چپ کرگئی۔

"ظفری کی وجہ سے ناں؟" دوسری طرف سے رواحہ پوچھ رہا تھا۔ "لیکن آپ کو بھلا ظفری سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے ڈرنا تو اسے چاہیے۔" اس کا لہجہ بہت نرم تھا دل میں اترتا ہوا سا؟ کتنا خوب صورت لہجہ تھا اور کتنی سحر انگیز آواز...... وہ اس سحر میں کھوسی گئی۔

"ویسے ظفری بھی آج کل یونیورسٹی نہیں آرہا۔" اس نے بتایا تو ارتقاع نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

"آپ پریشان ہیں رتی...... پلیز پریشان نہ ہوں مجھے اندازہ تھا آپ کی پریشانی کا میں آپ کو پہلے فون کرتا لیکن میرے پاس آپ کا نمبر نہیں تھا آج ہی نمبر ملا ہے۔"

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے اس کا نمبر کہاں سے ملا کیا عالیہ سے......؟ لیکن وہ پوچھ نہ سکی بس خاموشی سے اسے سنتی رہی۔

"آپ جانتی ہیں ان دنوں سر حفیظ کتنے اہم لیکچر دے رہے ہیں۔ آپ کی اسٹڈی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔ آپ کل سے یونیورسٹی آئیں گی رتی اور آپ کو کسی سے ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"جی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"اول تو ظفری اب آپ کو پریشان نہیں کرے گا لیکن اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ہم ہیں ناں، یوں بھی ظفری آپ کا دوست تھا۔ کوئی دوست بن کر وار کرے تو آدمی بے خبری میں مارا جاتا ہے لیکن اب کم از کم وہ بے خبری میں وار نہیں کرسکتا۔" وہ سمجھا رہا تھا اور وہ ایک انوکھی سی کیفیت میں گھری ہوئی تھی اسے رواحہ کی بات سننا اچھا لگ رہا تھا۔

"تو پھر آپ کل آرہی ہیں ناں؟" اس نے تصدیق چاہی تھی۔

"جی، میں کل آؤں گی۔"

"گڈ...... تو پھر کل انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔" فون بند ہوگیا تھا لیکن وہ فون ہاتھ میں لیے حیران بیٹھی تھی۔ اندر دل کی دھڑکنوں نے اودھم مچایا ہوا تھا کیا اس طرح بھی ہوتا ہے کبھی کہ کوئی لمحوں میں اتنا قریب آجائے جیسے صدیوں کی آشنائی ہو یہ رواحہ حسن ایک سال سے اس کا کلاس فیلو تھا لیکن دل پہلے کبھی اس کے نام پر یوں نہیں دھڑکا

تھا۔ وہ اپنے دل کے ساتھ ہونے والی اس واردات سے پریشان تھی۔ اسے خود اپنا یقین نہیں تھا کہ وہ ارتقاع بابر کبھی کسی سے اتنا متاثر بھی ہوسکتی ہے۔ وہ اپنی کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پارہی تھی۔ اگر اس کیفیت کا نام محبت تھا تو کم از کم یہ نام اس وقت اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ اپنے ہی دھیان میں گم بیٹھی تھی۔ ٹی وی چل رہا تھا لیکن آواز بند تھی۔ جب ایمل لاؤنج میں آئی اور اس نے خاموش بیٹھی ارتقاع کو دیکھا۔ ایمل کے آنے پر بھی اس نے ایمل کی طرف نہیں دیکھا تھا ایمل کو وہ اداس اور پریشان لگ رہی تھی اور یونیورسٹی بھی نہیں جارہی تھی۔

''کیا ارتقاع کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟'' ایمل نے سوچا اور پریشان سی ہو کر اس کے قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ارفی بیٹا کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔'' ارتقاع نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم کچھ پریشان لگ رہی ہو ارفی بیٹا، کوئی بات ہے؟ کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ۔'' وہ اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی بات پریشان کررہی ہے۔ مجھ سے کہو گڑیا ماں ہوں میں تمہاری۔''

اس نے ایمل کی طرف دیکھا اسے یقین تھا کہ وہ اس کی سگی ماں نہیں ہے اگرچہ بابر نے کھل کر اس بات کا اعتراف نہیں کیا تھا لیکن اس کا مبہم انداز اسے شک میں مبتلا کرتا تھا بلکہ یقین دلاتا تھا کہ ایمل اس کی سگی ماں نہیں ہے گو اسے بابر کے کاغذات سے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا تھا لیکن پھر بھی بہت ساری باتیں تھیں جن پر پہلے اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا لیکن اب غور کرتی تھی۔ بچپن سے ہی وہ ایمل کی نسبت بابر کے زیادہ قریب رہی تھی اور بابر نے جس طرح اس کے لاڈ اٹھائے تھے اور اس کی ضدیں پوری کی تھیں ایمل نے نہیں۔ ایمل، افنان کے ساتھ مصروف رہتی تھی۔ بچپن میں وہ کچھ کمزور اور بیمار سا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہتا تھا کہ ایمل اسے گود میں بٹھائے اس کے ساتھ کھیلے، اسے توجہ دے لیکن کبھی تو افنان رو رہا ہوتا، کبھی اسے بھوک لگی ہوتی اور وہ دو سالہ ارتقاع ایمل سے مایوس ہو کر بابر کی گود میں پناہ لیتی۔ باپ کے بے جا لاڈ پیار نے اسے ضدی اور خودسر بنا دیا تھا۔ اس بنا پر اس نے بچپن میں دو تین بار ماں سے تھپڑ بھی کھائے تھے۔ بچپن میں وہ سمجھتی تھی کہ ایمل، افنان سے اس سے زیادہ محبت کرتی ہے لیکن اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ایمل اس کی سگی ماں نہیں ہے لیکن اب یہ خیال دل سے نکلتا ہی نہیں تھا ہر روز کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی کہ اس کا یقین پختہ ہوتا چلا جاتا۔ ایک بار اس نے بابر سے پوچھا تھا کہ اس کا نام کس نے رکھا تھا تب بابر نے بتایا تھا کہ اس کا نام خود اس نے رکھا تھا لیکن تمہاری ماما نے کہا یہ مشکل نام ہے میں تو اسے رتی بلایا کروں گی لیکن ایمل نے اسے کبھی رتی کہہ کر نہیں بلایا تھا وہ ہمیشہ اسے ارفی کہتی تھی جبکہ باقی سب اسے رتی ہی بلاتے تھے۔ اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے کبھی ایمل کے منہ سے اپنے لیے رتی نہیں سنا تھا۔ وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی لیکن اس وقت اس کے لہجے کی دلگرفتگی نے اس کے دل کو گداز کیا تھا۔ یہ بھی تو سچ تھا کہ ایمل نے کبھی اس کے ساتھ روایتی سوتیلی ماں کا سلوک نہیں کیا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک تو اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ اس کی روک ٹوک سے چڑتی بھی تھی لیکن اس نے اپنے دل میں اتنی بیگانگی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

''ارفی میری جان بتاؤ ناں کیا بات ہے؟'' ایمل نے اس کی خاموشی سے گھبرا کر پھر پوچھا۔

''کچھ نہیں ماما۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں ہے بس یونہی موڈ نہیں ہو رہا تھا یونیورسٹی جانے کا، کل سے چلی جاؤں گی۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو ناں ارفی۔ دیکھو مجھ سے کوئی بات مت چھپانا۔ ماں باپ سے زیادہ کوئی آپ کا ہمدرد اور خیر خواہ نہیں ہوتا جس طرح وہ آپ کا تحفظ کرسکتے ہیں اور کوئی نہیں کرسکتا۔'' ایمل کے لہجے میں اب بھی تشویش تھی۔

''کوئی بھی تو بات نہیں ہے ماما اگر ہوتی تو ضرور بتاتی۔ آپ کو نہ سہی پاپا کو تو ضرور بتاتی۔'' وہ مسکرائی تو ایمل کو بھی یقین آگیا کہ وہ اپنی ہر بات بابر سے ضرور شیئر کرتی تھی۔ ''بی لیومی ماما۔'' اس نے پھر یقین دلایا۔

مسکراہٹ اسی طرح اس کے ہونٹوں پر ٹھہری ہوئی تھی اور اس کے اوپر والے دانت ذرا سے نظر آرہے تھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ترتیب سے جڑے سفید دانت۔ وہ کھوسی گئی تھی کتنے سالوں بعد اس کی یہ مسکراہٹ اسے کسی کی یاد دلا گئی تھی۔ ایسے ہی ذرا، ذرا سے فاصلے پر ترتیب سے جڑے دانت...... وقت نے جیسے پیچھے کی طرف ایک زقند لگائی۔

''افوہ مدثر، یہ تمہارے دانت ہر وقت باہر ہی کیوں نکلے رہتے ہیں؟'' وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی اور آئینے میں اس نے اپنی پیچھے کھڑے مدثر کے عکس کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تھا۔

مدثر کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کے پیچھے سے ہٹ کر اس کے پہلو میں آکھڑا ہوا تھا اور مسکراہٹ مزید گہری ہوئی تھی۔

''تو کیوں نہ نکلیں دانت باہر...... اپنی محبت کا پالینا، مل جانا کچھ کم ہوتا ہے کیا، شکر کرو میں دیوانہ نہیں ہوا ورنہ میرا تو جی چاہتا تھا قہقہے لگاؤں، ناچوں، گاؤں اور پوری دنیا کو اپنی اس خوشی میں شریک کرلوں۔ سب کو بتاؤں کہ مجھے میری محبت مل گئی ہے۔''

''تم سچ پاگل ہو مدثر۔'' وہ اندر ہی اندر اترائی تھی لیکن بظاہر اس نے منہ بنایا تھا۔

''ہاں، پاگل ہوں...... دیوانہ ہوں تمہارا، یہ پاگل پن اور دیوانگی تمہارے لیے ہے ایما۔''

''تم پہلے تو ایسے نہ تھے مدثر اتنے جذباتی، اتنے رومینٹک!'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''میں پہلے بھی ایسا ہی تھا اتنا ہی جذباتی' اتنا ہی رومینٹک۔'' اس نے ایک بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے ایک شوخ سی جسارت کی تو وہ بلش ہوگئی۔

''لیکن مجھے تو کبھی نہیں لگا تھا کہ تم اتنے رومینٹک ہو...... ہمیشہ اقبال کے شعر سناتے تھے اور بات کرتے ہوئے کوئی سنجیدہ بوڑھے پروفیسر لگتے تھے۔'' وہ نچلے ہونٹ کا ایک کونا دانتوں تلے دبا کر مسکرائی تھی لیکن وہ سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''میں ڈرتا تھا ایما اپنے جذبوں کے بے وقعت ہو جانے سے...... ان کے رائگاں چلے جانے سے۔ مجھے خوف آتا تھا کہ ہمارے راستے الگ ہوگئے تو میرے کہے الفاظ تمہارا جینا مشکل کردیں گے۔'' اس نے اس کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف کیا تھا اور پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھیگتی آواز میں کہا۔ ''مجھے اب بھی کبھی کبھی بڑا خوف آتا ہے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہماری خوشیوں کو نظر نہ لگ جائے...... کہیں ہم بچھڑ نہ جائیں۔''

''اللہ نہ کرے۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا، وعدہ کرو کچھ بھی ہو جائے میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔'' اور اس نے وعدہ کیا تھا۔

''ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہیں گے مدثر...... زندگی کی آخری سانسوں تک......''

لیکن زندگی کی طرح لفظ بھی کبھی کبھی کتنے بے اعتبار ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنے ہی کہے ہوئے لفظوں سے مکر جاتا ہے۔ اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ کب اس نے کیا کہا تھا۔ اس کے لبوں سے سسکی سی نکل گئی تو اس نے چونک کر ارتقاع کی طرف دیکھا وہ ٹی وی کی طرف متوجہ تھی۔

مدثر سے اس کی شادی نہیں ہوسکتی۔ اس نے خود کو بہت بار باور کروانے کی کوشش کی تھی۔ ڈیڈی نے مدثر کے

ڈیڈی کو انکار کر دیا تھا۔اس کا اور مدثر کا ساتھ ممکن نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر ممی، ڈیڈی کو مدثر کا رشتہ قبول نہیں ہوا تو وہ ایسا کچھ نہیں کرے گی جس سے اس کے ڈیڈی کی عزت پر حرف آئے۔ وہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی جو انہیں دکھ پہنچائے ایسا دکھ جیسا اس کے دادا اور دادی نے اٹھایا تھا لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی جو تڑپ رہا تھا، مچل رہا تھا۔ رو، رو کر اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے اگر اسے مدثر کی رفاقت نہ ملی تو وہ مرجائے گی۔ وہ اس کے بغیر جی نہیں سکے گی۔

''مدثر میں کیا کروں، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی پلیز کچھ کرو۔'' اس نے بے حد مایوس ہو کر اسے فون کیا تھا۔

''میں ڈیڈی کو دکھ نہیں دینا چاہتی مدثر اور میں تمہارے بغیر بھی جی نہیں پاؤں گی۔'' وہ رو پڑی تھی۔ مدثر اس سے زیادہ مایوس اور اداس تھا پھر بھی اس نے سمجھایا تھا۔

''ہم یہ جانتے تھے ایما کہ طبقاتی فرق کی وجہ سے شاید ہمارا ملن ممکن نہ ہو پھر بھی ہمارے دل ایک دوسرے کی محبت میں دھڑکے، یہ محبت خود بخود ہمارے دل میں پیدا ہوئی۔ یہ محبت کبھی ختم نہیں ہو سکتی یہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہے گی۔ ہر محبت کے نصیب میں وصل نہیں ہوتا۔ والدین اولاد کے لیے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں ان کی بہتری کے لیے ہی کرتے ہیں شاید تمہاری بہتری اسی میں ہو۔'' وہ خود بھی رو پڑا تھا اور اس کے آنسو جیسے اس کے دل پر گرے تھے۔

''نہیں مدثر...... تم نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ میں نے صرف تمہارے سنگ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے ہیں۔ میں کسی اور کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ تم مجھے جو کہو گے میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ جذباتی سی ہو گئی تھی ہارنے لگی تھی اور بھول گئی تھی کہ جب اس کی پھپو نے اپنی پسند سے شادی کی تھی تو دادا، دادی کو روتے دیکھ کر وہ سوچتی تھی کہ وہ کبھی پھپو کی طرح اپنے ممی، ڈیڈی کو ناراض نہیں کرے گی۔

''نہیں...... میں تمہیں کچھ بھی ایسا کرنے کو نہیں کہوں گا جس سے تمہارے خاندان کی عزت پر حرف آئے۔ تم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو پلیز اور بھول جانا وہ سب جو ہمارے درمیان تھا۔''

''کیسے بھول جاؤں مدثر؟''

''وقت ہر زخم مندمل کر دیتا ہے ایک دن۔'' اور اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''پلیز...... پھر فون نہ کرنا کہیں اختیار کی لگام میرے ہاتھوں سے چھوٹ نہ جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے کسی عمل سے میرے اور تمہارے خاندان کی عزت پامال ہو۔'' اس نے فون بند کر دیا تھا اور وہ بلک، بلک کر رونے لگی تھی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ، خاندان کی عزت کو محبت پر قربان نہیں کیا جا سکتا تھا اسے اپنی جذباتیت پر شرمندگی ہوئی تو وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگی تھی۔

تب ہی ڈیڈی دستک دے کر اندر آگئے تھے اس نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر یک دم اٹھ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔

''ایما...... میری جان، میری گڑیا۔'' وہ ہولے، ہولے اس کا سر تھپتھپانے لگے تھے۔ ''تم کیا سمجھتی ہو بیٹا کہ تمہارے ڈیڈی کو تم سے محبت نہیں ہے۔ میں نے تمہارے لیے جو بھی سوچا تھا تمہاری بہتری کے لیے سوچا تھا شاید میں تھوڑا سا خود غرض ہو گیا تھا۔ سوچا کہ بابر سے شادی کر کے تم ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہو گی۔ میں اب بھی جو فیصلہ کروں گا تمہاری بہتری کے لیے ہی کروں گا تمہیں اپنے ڈیڈی پر اعتبار ہے ناں؟''

''جی۔'' اس نے سر ہلایا تھا اور انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

''سوری ڈیڈی۔''

''کس بات کے لیے؟'' انہوں نے پیار سے اسے دیکھا تھا اور اس نے نظریں جھکالی تھیں وہ اپنی سوچ اور جذباتیت پر شرمندہ تھی لیکن وہ یہ بات بھلا ڈیڈی کو کیسے بتاتی کہ کچھ دیر پہلے وہ کیا سوچ رہی تھی کہ اگر مدثر کہے گا تو وہ اس سے کورٹ میرج کرلے گی۔ یہ تو مدثر سے شادی کے بعد اسے پتا چلا تھا کہ ڈیڈی نے ایکس ٹینشن پر اس کی اور مدثر کی باتیں سن لی تھیں اور مدثر سے متاثر ہوئے تھے۔

''اب مت رونا تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔'' وہ اس کا سر چوم کر چلے گئے تھے اور وہ لٹی، لٹی سے بیٹھی رہ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے زندگی ہولے، ہولے اس کے اندر مر رہی ہو۔ وہ جانتی تھی ڈیڈی کا فیصلہ قبول کر کے وہ کبھی خوش نہیں رہ سکے گی لیکن پھر بھی اس نے ڈیڈی کا فیصلہ قبول کرلیا تھا کہ اسے اپنی پھپھو جیسا نہیں بننا تھا۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آگئے تھے اور ایک بار پھر وہ رو رہی تھی اور جب ممی نے آکر بتایا تھا کہ ڈیڈی نے اس کی شادی مدثر کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے ممی کو دیکھتی رہی تھی۔

''وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ تمہاری شادی بابر کے ساتھ ہوتی اور تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتیں۔'' ممی بہت اداس اور دلگرفتہ لگ رہی تھیں۔

''ممی۔'' وہ ان سے لپٹ گئی تھی۔ ''سوری میں نے آپ کو دکھ دیا لیکن میں نے بابر بھائی کے متعلق ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مدثر اگر نہ ہوتا تب بھی بابر بھائی نہیں۔ پلیز ممی مجھے معاف کردیجیے گا۔ خفا مت ہوں مجھ سے۔'' اور ممی اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے ہولے، ہولے تھپکنے لگی تھیں۔

''میں ناراض نہیں ہوں بیٹا۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے' ہمارے لیے تمہاری خوشی ہر شے سے زیادہ مقدم ہے۔'' اور جب اس نے سر اٹھایا تھا تو ڈیڈی دروازے پر کھڑے تھے۔

''ڈیڈی میں بہت بری ہوں، میں نے آپ کو دکھ دیا آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے ڈیڈی اگر آپ کو مدثر پسند نہیں تو......'' وہ ایک بار پھر جذباتی ہو رہی تھی اور آنسوؤں نے اس کا حلق سی دیا تھا۔

''نہیں...... میری بیٹی بہت اچھی ہے اور مدثر اچھا لڑکا ہے۔'' ان کی آنکھوں میں مدثر کے لیے ستائش تھی۔

''میں پہلے اسے دولت کے پیمانے پر پرکھ رہا تھا لیکن دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی وہ ایک اعلیٰ کردار کا اچھی سوچ رکھنے والا لڑکا ہے اور ایسا ہی لڑکا میری بیٹی کو ڈیزرو کرتا ہے۔''

''آپ خوش تو ہیں ناں ڈیڈی؟'' اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔

''میں خوش ہوں...... میری بیٹی کی خوشی ہی میری خوشی ہے۔'' اور وہ کتنے ہی دن بے یقین سی رہی تھی اور یقین تو مدثر کو بھی نہیں آیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں کتنی ہی بار پوچھتا تھا۔

''یہ سچ ہے ناں...... میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ناں؟'' لیکن یہ خواب نہیں تھا سچ تھا۔ ان کا ماسٹر مکمل ہوتے ہی بہت دھوم دھام سے ان کی شادی ہوگئی تھی اور وہ مدثر کے ساتھ بہت خوش تھی۔ مدثر کے گھر سوائے اس کے بابا کے اور کوئی نہیں تھا اور بابا تو محبتوں اور شفقتوں کا سمندر تھے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے، ہر وقت اس کے لیے اور مدثر کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ زندگی اتنی خوب صورت ہوگی اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ بابا اور مدثر بھر، بھر کر محبتوں کے خزانے لٹاتے تھے اور ان محبتوں کو سمیٹتے، سمیٹتے اس کا دامن تنگ پڑنے لگا تھا۔ وہ سوچتی تھی کیا اس روئے زمین پر اس سے زیادہ خوش قسمت بھی کوئی ہوگا...... وقت جیسے پر لگا کر اڑا جا رہا تھا اور جس روز اسے پتا چلا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو مدثر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پورے شہر میں چراغاں کردے اور بابا...... ان کی خوشی بھی دیدنی تھی وہ اس طرح اس کا خیال رکھ رہے تھے کہ اگر مدثر کی امی زندہ ہوتیں تو شاید اس طرح اس کا خیال نہ رکھ پاتیں۔ کالج سے واپسی پر ہر روز لدے پھندے گھر آتے تھے۔ فروٹ اور جوسز کے علاوہ نومولود بچے کے استعمال کی کوئی

نہ کوئی چیز خرید کرلے آتے۔ ڈھیروں کپڑے اور دوسری ضرورت کی چیزیں۔

''بابا ابھی اتنی جلدی ان سب کی کیا ضرورت ہے؟'' اسے بابا سے شرم آتی۔

''ضرورت تو پڑے گی ناں بس سامنے نظر آگئی تو لے لیں۔ ارادتاً تو نہیں گیا تھا لینے۔'' اسے بابا کی بات پر ہنسی آتی لیکن وہ اپنی ہنسی چھپا جاتی اور جس روز پتا چلا تھا کہ اس کے ہاں جڑواں بچوں کی آمد متوقع ہے تو اس روز تو مدثر نے باقاعدہ بھنگڑا ڈالا تھا۔ بابا اور وہ مدثر کی دیوانگی پر مسکراتے رہے تھے اور مدثر نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''سنو میں صرف انہی دو بچوں پر اکتفا نہیں کروں گا' مجھے کم از کم دو بچے اور چاہئیں۔''

''توبہ ہے مدثر...... اب دو آئے نہیں اور تم دو مزید کا لالچ کرنے لگے ہو۔'' اس نے اسے گھورا تھا۔

''تو میں نہیں چاہتا میرے بچوں کا بچپن بھی میری طرح گزرے...... تنہا، خاموش، اکیلا اکیلا سا۔ میرا تو جی چاہتا ہے میرا آنگن بچوں سے بھرا ہو وہ سب مل کر کھیلیں کودیں، لڑیں جھگڑیں اور گھر میں خوب ہنگامہ اور رونق ہو۔''

ان دنوں زندگی میں مزید رنگ بھر گئے تھے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود بابا اور مدثر کچھ نہ کچھ آنے والے بچوں کے لیے خرید کرلے آتے تھے۔

''ٹھیک ہے ناں کچھ اور جو میرے ذہن میں نہیں ضرورت ہو تو بتانا۔'' بابا پوچھتے تو وہ جھینپتی، شرماتی۔

''ممی کہہ رہی تھیں مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود کرلیں گی سب۔''

''ہاں تو ضرور کریں ان کا بھی حق ہے لیکن ہمیں بھی تو اپنے شوق پورے کرنے ہیں۔'' بابا ان دنوں بالکل بچہ بنے ہوئے تھے۔ وہ گھنٹوں بیٹھے نام سوچتے رہتے۔ مدثر کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ کون سا نام زیادہ اچھا ہوگا اسے کئی نام پسند تھے۔

''سنو مجھے شہریار نام پسند ہے۔ عبداللہ بھی اچھا ہے اور بابا کو تو عمر، بلال، تیمور جانے کون، کون سے نام پسند ہیں اور... تمہیں کون سے نام پسند ہیں؟''

''بچے دو ہیں دس نہیں ہیں۔'' وہ اسے چڑاتی تو اس کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ نمودار ہو جاتی۔

''چلو اس بار بابا کی پسند کا نام رکھ لیں گے اور اگلی بار تمہاری پسند کا اور پھر اگلی بار میری پسند کا اور......''

''مدثر۔'' وہ اسے گھورتی۔ ''بچے دو ہی اچھے۔''

''ہائے نہیں یار...... دیکھو یہ سارے نام اتنے پیارے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ سارے پیارے، پیارے نام میرے بچوں کے ہوں۔''

وہ اس کی پیٹھ پر مکا مارتی۔

خوشی کی تتلیاں جیسے ہر وقت اس چھوٹے سے گھر میں رقص کرتی تھیں۔ بابا ہر روز ان کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کرتے تھے لیکن پھر کیا ہوا تھا ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی تھی۔ سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ سارے خواب مٹی میں مل گئے تھے وہ جیسے خوشیوں کا جھولا جھولتے بہت بلندی سے نیچے گری تھی۔

ان دنوں وہ بڑی پھپھو کی بیماری کی وجہ سے ممی ڈیڈی کے گھر آئی ہوئی تھی۔ بڑی پھپھو کئی سال پہلے بیوہ ہوگئی تھیں چونکہ اولاد نہیں تھی اس لیے دادا، دادی کی زندگی میں ہی وہ ادھر آگئی تھیں اور ایمل کو ان سے بہت محبت تھی۔ اس لیے ان کی بیماری کا سنتے ہی وہ ادھر آگئی تھی۔ مدثر بہت بے چین تھا۔

''یار میں تمہارے بغیر کیا کروں گا؟''

''وہ جو پہلے کرتے تھے۔''

''یہ ظلم ہے میرے ساتھ زیادہ دن مت لگانا۔''

''اچھا۔'' اس نے وعدہ کرلیا تھا لیکن پھر اس کی اپنی طبیعت ہی خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر نے اسے بیڈ ریسٹ بتایا تھا اور ممی نے اسے روک لیا۔

مدثر نے گھر چلنے کی ضد کی لیکن بابا نے اسے سمجھایا تو مجبور ہوگیا لیکن دن میں دس، دس بار فون کرتا۔ صبح کالج جاتے اور شام کو کالج سے واپس آتے ہوئے چکر لگاتا۔ وہ اس کی دیوانگی پر ہنستی۔

''کالج میں کیسے وقت گزارتے ہو؟''

''سچ بتاؤں بالکل دل نہیں لگتا۔'' وہ بچوں کی طرح بسورتا اور وہ دل ہی دل میں اس کی محبت پر نازاں ہوتی۔ پھپھو، ممی، ڈیڈی سب ہی اس کی خوشگوار زندگی سے مطمئن تھے لیکن اس روز جب بابر نے پوچھا۔

''تم خوش تو ہو ناں؟''

''ہاں بہت۔'' اس نے بے حد حیران ہوکر اسے دیکھا تھا۔ بابر سے شادی سے پہلے بھی اس کی بے تکلفی نہیں تھی اور نہ ہی زیادہ بات چیت ہوتی تھی اور اب بھی رسمی سی بات چیت ہوتی تھی۔ جب سے وہ ممی کے گھر آئی تھی چند بار ہی براہِ راست بات ہوئی تھی لیکن اس وقت کمرے میں لیٹے، لیٹے اس کا دل گھبرایا تو وہ اٹھ کر لاؤنج میں آگئی تھی۔ ممی، ڈیڈی کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھیں۔ پھپھو اپنے کمرے میں تھیں اور بابر لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔ جہاں ایک دلچسپ پروگرام لگا ہوا تھا۔ تب اچانک ہی آواز آہستہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''مدثر تمہارے ساتھ ٹھیک تو ہے ناں؟'' لمحے بھر بعد اس نے پھر پوچھا تھا۔

''کیا بات ہے بابر بھائی، آپ کیوں پوچھ رہے ہیں یہ؟'' اس بار جواب دینے کے بجائے اس نے خود ہی سوال کرڈالا تھا۔

''بس یونہی۔'' بابر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

''یونہی تو نہیں کوئی بات تو ہے؟'' وہ متجسس ہوئی تھی۔ ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مدثر کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہوگا؟''

''نہیں...... بس میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ ٹھیک ہے تم خوش ہو...... تم نے کہا کہ تم خوش ہو تو......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''لیکن آپ یہ کیوں جاننا چاہتے تھے؟'' اس کے اندر تجسس پیدا کرکے وہ انجان بن رہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے آپ کچھ چھپا رہے ہیں؟''

''تم یقین نہیں کروگی اس لیے بتانے کا فائدہ۔''

''یقین کرنا یا نہ کرنا تو بعد کی بات ہے، آپ بتائیں تو۔'' وہ بضد ہوئی تھی۔

''تم بہت ضدی ہو ایمل۔'' بابر نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا اور لمحہ بھر بعد آہستگی سے بتایا۔ ''مدثر تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہے ایما۔''

''نہیں۔'' اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔ ''ایسا نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''مجھے پتا تھا تمہیں یقین نہیں آئے گا، اس لیے میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا۔''

''مدثر ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' اسے پورا یقین تھا۔

''سے بی۔'' بابر نے کندھے اچکائے تھے اور ٹی وی بند کرکے لاؤنج سے چلا گیا تھا۔

اسے مدثر پر یقین تھا۔ اس کی محبتوں پر اعتبار تھا لیکن پھر بھی اس کے اندر بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ مدثر ایسا نہیں ہوسکتا اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا اور مطمئن بھی ہوگئی۔ مدثر کی وارفتگیوں اور محبتوں میں کھو کر وہ بابر کی کہی ہوئی بات بھول گئی تھی۔ مدثر تو ایسا ہی تھا روزِ اول کی طرح فون کرتا تو بند کرنا بھول جاتا۔

''مجھے تمہارے بغیر نیند نہیں آتی سچ...... کب آؤ گی؟''

''ڈاکٹر نے ابھی ایک ماہ کا اور بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔''

''تو بیڈ تو یہاں بھی ہیں اِدھر آکر بیڈ ریسٹ کرلو۔'' وہ چڑتا اور وہ اس کی محبتوں پر مغرور ہوجاتی۔

بابا بھی صبح شام فون پر اس کی خیریت پوچھتے تھے اور کبھی کبھار ملنے بھی آجاتے تھے پھر کئی دن گزر گئے۔ بابر سے کھانے اور ناشتے کے وقت ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اپنی جاب میں بزی تھا۔ ممی اس کے لیے لڑکی تلاش کررہی تھیں بابر نے پھر کوئی ایسی بات نہیں کی تھی لیکن ایک دن اچانک اس نے ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

''آج مدثر ملا تھا، شاپنگ کررہا تھا۔ ایک لڑکی بھی ساتھ تھی غالباً کوئی رشتے دار ہوگی۔''

''لیکن اس کی تو کوئی رشتے دار لڑکی نہیں ہے بس ایک پھپھو تھیں جو گاؤں میں رہتی تھیں اور ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ ضرور مونا ہوگی۔'' اس نے اپنی پلیٹ میں چکن کا پیس رکھتے ہوئے سوچا۔

''یہ لڑکا تو پاگل ہے۔'' ممی نے مدثر کی شاپنگ پر تبصرہ کیا تھا۔ ''ہر روز بلاوجہ ہی ڈھیروں چیزیں خرید لاتا ہے، تم اسے منع کیوں نہیں کرتیں؟''

''کیا منع کروں ممی! اس کا تو جی چاہتا ہے کہ مارکیٹ میں جو کچھ بھی بچوں کی ضرورت کا ہے سب خرید لائے۔'' اور شام کو جب مدثر آیا تو واقعی وہ بچوں کے بہت پیارے بلینکٹ خرید کر لایا تھا ایک پنک، ایک اسکائی بلو۔

''کیسے ہیں؟'' اس نے بہت اشتیاق سے پوچھا تھا۔

''پیارے ہیں لیکن بابا پہلے ہی دو بلینکٹ لاچکے ہیں۔''

''تو مجھے یہ اچھے لگے، دیکھو کتنے نرم اور ملائم ہیں۔'' اور اس کے ہاتھ سے کمبل لیتے ہوئے اس نے یونہی سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

''تم کس کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئے تھے؟''

''کسی کے ساتھ نہیں اکیلا ہی گیا تھا، کالج سے نکلا تو سوچا اپنے لیے کف لنکس اور ٹائی لے لوں تو بس یہ نظر آگئے خرید لیے۔'' اور اس روز پہلی بار اس کے دل میں شک کا کانٹا چبھا تھا۔ مدثر کے ساتھ اگر کوئی تھی تو اس نے چھپایا کیوں...... کیا اس کے دل میں کوئی چور ہے اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ شک کے یہ کانٹے بڑھتے گئے۔ جیسے کانٹوں کی پوری فصل اگ آئی تھی۔ بابر کی سرسری سی کی گئی بات اسے گھنٹوں پریشان رکھتی تھی۔ مدثر حیران تھا۔

''کیا بات ہے ایما تم اتنی چڑچڑی کیوں ہورہی ہو؟''

لیکن وہ اسے کیا بتاتی کہ شک کے کوڑیالے ناگ اپنی لمبی زبانیں نکالے ہمہ وقت اسے ڈستے رہتے ہیں اس کی طبیعت ٹھیک ہوگئی تھی لیکن گھر جانے کو اس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ مدثر کی محبتیں اس کی شدتیں سب اسے مصنوعی، مصنوعی سی لگتیں۔ انہی دنوں جب بابا اسے گھر لے کر آنے کی باتیں کررہے تھے بڑی پھپھو کا انتقال ہوگیا اور وہ خاموش ہوگئے۔

پریگنینسی کی تکالیف، بیزاری اور چڑچڑاپن مدثر کی محبتوں پر شکوک اور پھپھو کی ڈیتھ وہ بہت ڈپریسڈ اور ٹینسڈ تھی اسی ٹینشن میں وہ گھر سے باہر نکل کر پورچ کی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گئی تھی اور لان میں مالی کو گھاس پر مشین چلاتے

دیکھ رہی تھی۔ پھپھو کی ڈیتھ کو پانچ دن ہو گئے تھے اور بابا آج کل میں اسے آکر لے جاتے۔ وہ بابا کے سامنے انکار نہیں کر سکتی تھی جبکہ مدثر سے اسے بہت سی شکایتیں تھیں۔

بابر نے نہ جانے کتنی بار اسے کسی لڑکی کے ساتھ لنچ کرتے، گھومتے، آئس کریم کھاتے، شاپنگ کرتے دیکھا تھا لیکن وہ ہر بار انکار کر دیتا تھا۔

''میرے ساتھ بھلا کس لڑکی نے ہونا ہے، یہ روایتی بیویوں والے شک مت کیا کرو۔'' اس نے سوچا اگر بابا لینے آئے تو وہ بابا کو سب کچھ بتا دے گی۔

کسی قدر مطمئن سی ہو کر وہ پھر مالی کی طرف دیکھنے لگی تھی جو اب مشین ایک طرف رکھ کر باڑھ میں بیٹھے بلی کے بچے کو اٹھا کر گیٹ سے باہر لے جا رہا تھا۔ تب ہی بابر آکر اس کے پاس ہی سیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔

''وہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے، آج کل ہر رات ڈنر وہ اس کے ساتھ ہی کرتا ہے۔ تم میری کزن ہو میری بہت پیاری جان سے عزیز خالہ کی بیٹی۔ میں چاہتا ہوں تم مدثر پر اندھا اعتماد مت کرو۔ یہ اس طبقے کے لوگ مدثر کی طرح ہی امیر لڑکیوں کو سیڑھی بناتے ہیں۔ انہیں اپنی محبت کا دھوکا دے کر......'' وہ ہولے، ہولے کہہ رہا تھا اور ایمل کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر سب کچھ ڈھتا جا رہا ہو۔

مدثر کی محبتوں اور وفاؤں پر اس کا یقین اور اعتبار سب کرچی، کرچی ہو گیا ہو اور یہ کرچیاں اس کے دل و جان میں چبھی جا رہی ہوں شدید اذیت سے اس نے آنکھیں موند لیں اور اس درد کو برداشت کرنے کی کوشش کی جو دل و جان کو کاٹتا تھا۔

''تم اگر آج رات میرے ساتھ چلو تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا، میری بات کا شاید تمہیں یقین نہ آئے۔'' بابر نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اور اس نے سر ہلا دیا تھا اور اس رات بابر کے ساتھ اس ہوٹل کے ڈائننگ میں ایک ٹیبل پر مدثر کے ساتھ ایک ماڈرن لڑکی کو بیٹھے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔

''محبت اور نفرت کے درمیان بہت کم فاصلہ ہوتا ہے۔'' جتنی شدت سے اس نے مدثر کو چاہا تھا اس سے اس نے اس کے لیے اتنی ہی شدید نفرت محسوس کی تھی۔

ٹی وی کی آواز یکا یک بلند ہوئی وہ ماضی کی بھول بھلیوں سے واپس آچکی تھی۔ وہ چونک کر کچھ دیر یونہی خالی، خالی نظروں سے ارتقاع کی طرف دیکھتی رہی جو اب بھی پوری طرح ٹی وی کی طرف متوجہ تھی اور پھر بابر کی طرف دیکھنے لگی جو موبائل پر میسج پڑھتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ ان دنوں اس کا موڈ کافی خراب تھا اور وہ اس کے موڈ کی خرابی کی وجہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شاید کاٹن کے اس سودے میں اسے خاطر خواہ منافع نہیں ہوا تھا۔ اس نے خود ہی اندازہ لگایا تھا ورنہ اس کے پوچھنے پر اس نے کچھ نہیں بتایا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اگر اسے کچھ بتانا نہ ہوا تو وہ کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ ایسا ہی تھا اگر اسے کوئی بات نہ بتانی ہوتی تو کبھی نہ بتاتا۔ اس وقت بھی اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اس نے ایک سرسری سی نظر ایمل پر ڈالی اور پھر ارتقاع کے پاس رکا۔

''پاپا میری گاڑی؟'' ارتقاع کو یک دم ہی یاد آیا تھا کہ بابر نے اسے نئی گاڑی لے کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔

''اپنی ماما سے پوچھو اس نے منع کر دیا ہے تمہیں نئی گاڑی لے کر دینے سے۔'' ارتقاع نے مڑ کر ایمل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی لیکن کچھ کہے بنا وہ پھر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگی۔ ایمل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ بابر نے رات ہی اس سے ارتقاع کے لیے نئی گاڑی خریدنے کی بات کی تھی۔

''میں نے رتی سے وعدہ کیا تھا نئی گاڑی کا لیکن ان دنوں میرے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اٹھارہ لاکھ کی گاڑی اسے لے دوں۔ میری رقم اِدھر اُدھر کئی جگہوں پر پھنسی ہوئی ہے اگر تم اپنے اکاؤنٹ سے......''

''نہیں بابر۔'' اس نے بابر کی بات کاٹی تھی۔ ''ڈیڈی نے وہ رقم اس لیے میرے اکاؤنٹ میں جمع نہیں کروائی تھی... اگر کبھی کوئی مشکل آئے ایمرجنسی ہو جائے تو کام آئے جیسے تمہیں اب ضرورت تھی تو کام آگئی اور میں نہیں سمجھتی کہ ارفی کو نئی گاڑی کی ضرورت ہے۔ آٹل کا لیک ہونا کوئی بڑا مسئلہ تو نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا جتنی بھی رقم ڈیڈی نے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروائی ہے اسے محفوظ رہنا چاہیے آنے والے حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔'' وہ اپنے اکاؤنٹ سے مزید رقم نہیں نکلوانا چاہتی تھی۔ ممی سے اس نے یونہی سرسری ساذکر کیا تھا تو وہ خاصی ناراض ہوئی تھیں کہ اس نے بابر کو اس رقم کے بارے میں کیوں بتایا۔

''جانتی ہو پہلے بھی تقریباً ایک کروڑ روپیہ تھا تمہارے اکاؤنٹ میں جو تم نے بابر کو بزنس کے لیے دے دیا تھا......'' اس نے بابر کو ممی کی ناراضی کا نہیں بتایا تھا لیکن ارتقاع کے لیے گاڑی خریدنے سے منع کر دیا تھا۔

''ارفی کی ایجوکیشن کمپلیٹ ہوتے ہی میرا ارادہ اس کی شادی کا ہے، ممی کی نظر میں دو تین اچھے رشتے ہیں اس کی شادی پر میں اسے اس کی پسند کی گاڑی لے دوں گی۔'' اور بابر کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

''جیسے ہی مجھے رقم ملے گی میں تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروا دوں گا۔ تم پریشان مت ہو، تمہارے ڈیڈی کی دی ہوئی رقم تمہارے پاس محفوظ رہے گی۔ رہی گاڑی کی بات تو وہ رتی سے میں نے وعدہ کیا ہے تو میں ہی پورا کروں گا اپنی بیٹی کو خود گاڑی لے کر دوں گا۔''

''بابر......'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ ''میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا آپ کو رقم کی ضرورت تھی آپ نے استعمال کر لی ہم الگ تو نہیں ہیں، بابر! میں نے کب کہا کہ آپ رقم واپس اکاؤنٹ میں جمع کروائیں۔ ارفی میری بھی بیٹی ہے میں دشمن نہیں ہوں اس کی لیکن میں چاہتی ہوں کہ......''

''لیو اٹ ایمل یہ موضوع ختم ہو چکا۔'' اس کا لہجہ سخت اور انداز حتمی تھا۔ وہ بابر کے اس موڈ کی وجہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ بیتے سالوں میں بابر نے اس طرح بی ہیو نہیں کیا تھا جیسا ان دنوں کر رہا تھا۔ ہاں کبھی کبھار اس کا موڈ ضرور خراب ہوتا تھا لیکن اس طرح کا رویہ تو کبھی اختیار نہیں کیا تھا اس نے۔

''ارفی بیٹا میں دراصل چاہ رہی تھی کہ تمہیں گاڑی......'' اس نے ارتقاع کی آنکھوں میں شکایت کا رنگ محسوس کر لیا تھا۔

''اٹس او کے مما، میں نے آپ سے کوئی وضاحت تو نہیں مانگی۔'' ارتقاع کے لہجے کی بیزاری نے ایمل کو دکھی کیا اس نے شکایتی نظروں سے بابر کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملا رہا تھا۔ کال ریسیو ہوتے ہی وہ باتیں کرتا ہوا لاؤنج سے نکل گیا۔

☆☆☆

وہ بیزاری سے بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے کو کارپٹ پر آگے پیچھے کرتے ہوئے کارپٹ کے پھولوں کو اتنے دھیان سے دیکھ رہی تھی جیسے یہ کوئی بہت اہم کام ہو۔ اس کے سامنے صوفے پر صاحبزادہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی نظریں بار، بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں جبکہ ان کے برابر میں بیٹھے بخاری صاحب کی نظریں تو جیسے اس کے چہرے پر ہی چپک گئی تھیں اور وہ بار، بار اپنے ہونٹوں پر یوں زبان پھیر رہے تھے جیسے شدید پیاس نے ہونٹ خشک کر دیے ہوں۔ ہونٹوں پر زبان پھیرنے کے بعد وہ ایک طویل اور گہری سانس لیتے...... ''غالباً یہ وہی ڈائریکٹر یا پروڈیوسر ہیں جنہیں موتیا کے کہنے پر صاحبزادہ صاحب اپنے ساتھ لائے تھے تاکہ وہ اسے کوئی چانس دے کر اماں کی خواہش پوری کر دیں۔''

تجل نے کارپٹ کے پھولوں کو تکتے ہوئے سوچا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ موتیا کے پیچھے لاؤنج میں داخل

ہوئی تھی تو صاحبزادہ صاحب مبہوت سے ہو گئے تھے۔ سفید لباس میں وہ کوئی آسمان سے اتری اپسرا لگ رہی تھی۔ ایسا شفاف اور نوخیز حسن...... انہوں نے ایک شکایتی نظر شاہجہان بیگم پر ڈالی تھی جیسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہے ہوں ایسے نایاب ہیرے کو تو چھپا کر رکھا ہوا تھا اور ہمیں نقلی موتیوں پر ٹرخا دیا۔ شاہجہان بیگم نے نظریں چرا لی تھیں اور انجان بن کر موراں کو آواز دینے لگی تھی۔

''کہاں مر گئی ہو موراں، کیا کنواں کھودنے چلی گئیں؟'' صاحبزادہ صاحب نے دائیں طرف والے سنگل صوفے پر بیٹھی موتیا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس وقت قیامت ڈھا رہی تھی...... سانچے میں ڈھلا جسم، چمکتا ہوا سفید رنگ، لانبی گردن...... وہ ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ سجائے نثار ہوتی نظروں سے صاحبزادہ صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''خیر موتیا بھی کچھ کم نہیں۔'' انہوں نے دل ہی دل میں اعتراف کرتے ہوئے سجل کی طرف دیکھا۔ ان کے بالکل سامنے بیٹھی میک اپ سے بے نیاز یہ نوخیز لڑکی اپنی سادگی میں بھی قیامت سے کم نہ تھی جو لاؤنج میں آنے کے بعد سلام کر کے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور چہرے پر انتہائی بیزاری لیے، وہ تب سے اب تک نگاہیں جھکائے غالباً کارپٹ کے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

''کمال ہے شاہجہان بیگم ہم کئی بار لاہور بھی آئے...... یہاں بھی دو تین بار آنا ہوا لیکن آپ نے پہلے کبھی سجل سے متعارف نہیں کروایا؟'' آخر ان کے لبوں پر شکوہ آ ہی گیا۔

''ارے کیا بتاؤں صاحبزادہ صاحب، جن دنوں آپ لاہور آتے تھے اپنی بجو بہت چھوٹی تھی اور اسکول میں پڑھتی تھی۔ پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ گھر آ کر بھی کتابوں میں گھسی رہتی تھی اور پھر آپ وہاں ٹکتے کب تھے، آئے موتیا کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر چل دیے۔'' صاحبزادہ صاحب سے بات کر کے باقی کی آدھی بات شاہجہان نے بخاری صاحب کی طرف دیکھ کر کی۔

''اسے تو یوں بھی کسی شے سے دلچسپی نہ تھی، یہ تو اب پتا نہیں کیوں اسے اداکاری کا شوق چرایا ہے تو موتیا نے آپ سے ذکر کر دیا۔''

''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ ہم تو ایسے فن کے دیوانوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔'' بخاری صاحب کی نظریں بڑی دیر بعد سجل کے چہرے سے ہٹی تھیں اور اب وہ مسکراتی نظروں سے شاہجہان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک گھاگ ڈائریکٹر تھا چہرہ دیکھ کر اندر اتر جانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ سجل کی آنکھوں میں چھائی ناگواری اور چہرے پر پھیلی بیزاری سے جان گیا تھا کہ اداکارہ بننے کا شوق بیٹی کو نہیں ماں کو ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو اداکارہ بنانا چاہتی ہے جبکہ بیٹی کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں لگتی۔

''میں آج کل اپنی ایک نئی سیریل کے لیے ہیروئن کی تلاش میں تھا بالکل ایسا ہی نیا اور تر و تازہ چہرہ لانا چاہتا تھا میں، تو بس سمجھیں کہ میری تلاش ختم ہو گئی۔'' شاہجہان کی باچھیں کھل گئیں۔ ''اب دیکھیے گا ایک ہی سیریل کے بعد کیسے سجل بی بی کا طوطی بولتا ہے۔'' شاہجہان سے بات کرتے، کرتے بخاری صاحب نے ایک حریص سی نظر سجل پر ڈالی تو صاحبزادہ صاحب بھی اپنے اندر ابلتے جذبات پر قابو پا کر مسکرائے۔

''بالکل...... بالکل بخاری صاحب تو پارس ہیں پارس جس کو ہاتھ لگا دیں سمجھو وہ سونا ہو گیا۔'' بخاری کے لبوں پر تفخر بھرا تبسم نمودار ہوا۔

''آج کئی ایسے اداکار، رائٹرز، اداکارائیں جن کا طوطی بول رہا ہے ان سب کو اس مقام تک لانے میں بخاری کا ہی ہاتھ ہے۔ ایسے ہی تو لوگ کنگ میکر نہیں کہتے انہیں۔ جسے چاہیں زیرو کر دیں جسے چاہے ہیرو بنا دیں۔

آپ کی سجل کو بھی دیکھیے گا ایک روز صفِ اول کی ہیروئن بنا دیں گے۔''

''بڑی مہربانی بخاری صاحب۔'' شاہجہان کا دل تو بلیوں اچھل رہا تھا اور خوشی اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہوتی تھی۔

''آپ بے فکر رہیں شاہجہان بیگم، کل آڈیشن کے لیے بھجوا دیں۔'' وہ پھر سجل کو دیکھنے لگا تھا اور اسے دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اپنے مسلسل بجتے فون کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں تھا۔

''صاحب آپ کا فون آ رہا ہے۔'' موراں نے جوس کا گلاس اسے پکڑاتے ہوئے جتایا۔

''اوہ ہاں۔'' بخاری صاحب نے چونک کر گلاس پکڑتے ہوئے سجل کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور کوئی تیسری بار فون کی بیل کو نظر انداز کیا اور سجل سے پوچھا۔

''آج کل کون سا ڈراما زیادہ شوق سے دیکھ رہی ہیں آپ؟ کبھی میرا ڈائریکٹ کیا ہوا ڈراما بھی دیکھا؟''

''نہیں...... میں ڈرامے نہیں دیکھتی۔'' سجل نے پہلی بار کارپٹ سے نظریں ہٹا کر بخاری صاحب کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں واضح ناگواری تھی۔ صاحبزادہ صاحب دل ہی دل میں بے حد محظوظ ہوئے اور بہت دلچسپی سے سجل کی طرف دیکھا۔

''اور مجھے اداکاری بھی نہیں آتی، میں نہیں کر سکتی اداکاری۔'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد سجل نے کہا تو شاہجہان نے بے حد جز بز ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''لو بھلا اداکاری ایسا کون سا مشکل کام ہے، بخاری صاحب سکھا دیں گے۔''

''میں نے تو ایسے ایسے جاہل ان پڑھ لوگوں سے بھی اداکاری کروالی، آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ آپ بے فکر رہیں، یہ میرا ہیڈک ہے آپ کو سکھانا۔'' بخاری نے پُر شوق نظروں سے اسے دیکھا۔

حسن بھی تھا، تمکنت بھی تھی اور بے نیازی بھی...... بخاری سوچنے لگا کہ اسے ہیروئن کے کردار میں کیا، کیا تبدیلیاں کروانی ہوں گی۔ تھوڑی سی مغرور تھوڑی بے نیاز اور پھر اتنی حسین، بھلا سیریل کیسے ہٹ نہ ہوگا۔

''سنہری بہت اچھی ایکٹنگ کرتی ہے۔'' نجل نے شاہجہان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''اسے اپنے چہرے کے تاثرات بدلنے میں ملکہ حاصل ہے۔'' نجل نے شاہجہان کی ناراضی کی پروا کیے بغیر مزید اضافہ کیا۔

''سنہری کون؟'' بخاری چونکا۔

''میری منجھلی بیٹی ہے۔'' شاہجہان نے نجل کی اس بے وقت بات پر اندر ہی اندر دانت پیسے لیکن مصلحتاً لبوں پر مسکراہٹ سجالی۔

''بخاری صاحب سنہری تو سچ مچ سنہری ہے، سونے سے تراشی ہوئی، چمکتی دمکتی......'' صاحبزادہ صاحب کی آواز میں چہکار تھی۔

''ارے تو ان سے بھی ملوائیں...... کہیں نہ کہیں کوئی چانس نکل ہی آئے گا۔ جانتے تو ہیں ناں آج کل کیسے دھڑا دھڑ ڈرامے بن رہے ہیں۔'' اس کا فون پھر بجنے لگا تھا اس نے جھنجلا کر نجل کے چہرے سے نظریں ہٹا کر فون آن کیا اور کچھ دیر دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔

''بس آرہا ہوں ملک صاحب، پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ آپ بس نورین بی بی کی کچھ خاطر تواضع کریں۔'' فون بند کر کے اس نے پھر نجل کی طرف دیکھا۔

''سوری دراصل مجھے شوٹ کے لیے جانا ہے۔ آج میرے ڈرامے کی آخری قسط تھی اور نورین بی بی آج وقت پر پہنچ گئی ہیں اور اگر ناراض ہو کر چلی گئیں تو پھر جانے کب ہاتھ آئیں اور اگر آج یہ episode نہ کر سکا تو ملک صاحب کا غصہ بجا ہوگا۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔

''ارے بخاری صاحب چائے آرہی تھی۔'' شاہجہان بیگم نے اسے روکا۔

''چائے پھر کبھی سہی، ہاں کل بارہ بجے کے بعد آڈیشن کے لیے آجایئے گا۔'' اس نے نجل پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ صاحبزادہ صاحب وہاں ہی بیٹھے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ برسوں کی جان پہچان تھی لیکن شاہجہان بیگم نے کبھی نجل کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ شاہجہان بیگم بھی صاحبزادہ صاحب کی ناراضی نوٹ کر رہی تھی لیکن جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔ صاحبزادہ صاحب جب بھی لاہور آتے ان کے چوبارے پر ضرور آتے تھے۔ ہاتھ کے کھلے اور دل کے سخی تھے سو خوب آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ یوں بھی ان دنوں شاہجہان کا چوبارہ تھا یا پرستان تھا سر شام ہی پریوں کا میلا سا لگ جاتا۔ رنگ برنگے آنچل لہرانے لگتے، خوشبوئیں بکھر جاتیں ایک سے ایک طرح دار لڑکی تھی لیکن اب تو چوبارہ ویران ہی ہوگیا تھا۔ کچھ کو موذی امراض لگ گئے اور کچھ دوسرے چوباروں پر چلی گئیں چند ایک نے گھر بسا لیے۔ لے دے کر دو چار لڑکیاں ہی رہ گئی تھیں شاہجہان کے پاس...... صاحبزادہ صاحب دل والے تھے۔ چوبارے کا حال دیکھا تو انہیں کراچی آنے کی دعوت دے دی انہی کے آسرے پر کراچی آئی تھی اور یہ گھر بھی انہوں نے ہی موتیا کے لیے خریدا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ موتیا صرف ان کے لیے وقف رہے۔ وہ صاحبزادہ صاحب کو ناراض نہیں کر سکتی تھی اس لیے ان کا دل ملنے کی کوشش کی۔

''آپ کا بہت شکریہ صاحبزادہ صاحب کہ آپ نے میری نجل کے لیے کوشش کی۔ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی بہت حسرت تھی مجھے کہ میری بچو بڑی اداکارہ بنے۔''

''احسان کیسا شاہجہان بیگم، ہم موتیا کا کہا ٹال سکتے ہیں بھلا!'' موتیا کا چہرہ چمک اٹھا۔ ''لیکن ہمیں کبھی تم نے نجل کے رقص و آواز سے مستفید نہیں کروایا۔'' گلہ اب بھی ان کے لہجے سے جھلکتا تھا۔ موتیا نے بے چینی سے

پہلو بدلا اس کا چمکتا چہرہ ماند پڑ گیا تھا اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''بچو کو رقص نہیں آتا۔'' صاحبزادہ صاحب کے لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ مچھلی کو پانی میں رہ کر تیرنا نہ آتا ہو۔''

''ایسا ہی ہے صاحبزادہ صاحب، یہ تو شروع سے ہی پڑھائی میں پڑ گئی تھی اسے کبھی ناچ گانے سے دلچسپی نہیں رہی اور سچی بات ہے میں نے بھی کبھی اسے محفل میں بٹھانے کا نہیں سوچا۔ اس کے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی اولاد کو اس کام میں نہیں ڈالوں گی۔ ہم لاکھ برے سہی پر اپنے قول سے پھرنے والے نہیں۔''

شاہجہان نے جواب دیا تو صاحبزادہ صاحب کے لبوں پر بکھری استہزائیہ مسکراہٹ اور بھی گہری ہوگئی۔ نجل ایک دم کھڑی ہوگئی اس نے صاحبزادہ صاحب کو نہ تو خدا حافظ کہا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھا اور......

''اماں میں جا رہی ہوں۔'' کہتی ہوئی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

''اپنی اس بیٹی کو تم نے ادب آداب نہیں سکھائے شاہجہان بیگم۔'' صاحبزادہ صاحب نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔

''نہیں صاحبزادہ صاحب ایسی بات تو نہیں ہے بس اجنبیوں سے جلدی گھلتی ملتی نہیں ہے۔'' شاہجہان بیگم نے شرمندگی سے کہا۔ اسے نجل پر غصہ تو بے حد آرہا تھا لیکن پی گئی۔ اب بھلا اگر صاحبزادہ صاحب کو غصہ آگیا تو اس اجنبی شہر میں وہ بھلا کیا کرے گی بے یارومددگار۔

''خیر اب شوبز میں بھجوانا ہے تو کچھ ادب آداب تو سکھانے ہوں گے اسے اور ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں کہ اس کے باپ سے وعدہ کیا تھا تو کون تھا اس کا باپ؟'' اور نجل جو لاؤنج سے باہر نکل کر لمحے بھر کے لیے رکی تھی اس کا پورا وجود کان بن گیا۔

''تھا کوئی شریف آدمی۔'' شاہجہان بیگم کا انداز ٹالنے والا تھا۔

''اچھا ایسا ہی شریف زادہ تھا تو ساتھ کیوں نہ لے گیا، تمہارے پاس کیوں چھوڑ گیا؟'' صاحبزادہ صاحب کے طنز کو شاہجہان بیگم نے ہنس کر پی لیا۔

''مر کھپ گیا ہوگا، مجھے اتا پتا معلوم نہ تھا ورنہ پہنچا دیتی اسے اس کے پاس۔'' اور نجل کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ اس کا باپ ایک شریف آدمی تھا، پتا نہیں شاہجہان سچ کہہ رہی تھی یا جھوٹ۔

''کیا خیال ہے موتی کچھ دنوں کے لیے مری، اسلام آباد کا چکر نہ لگا آئیں؟'' صاحبزادہ صاحب اب موتیا کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ کھل اٹھی تھی اور اس کا بجھا ہوا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

''کراچی کے اس ایک جیسے موسم سے دل اوب گیا ہے شاہجہان بیگم۔ اجازت ہے موتیا کو کچھ دنوں کے لیے مری لے جاؤں؟''

''آپ کو اجازت کی کیا ضرورت ہے صاحبزادہ صاحب آپ حکم کریں۔'' شاہجہان نے بھی اطمینان کی سانس لی کہ صاحبزادہ صاحب، نجل کے موضوع سے ہٹے لیکن صاحبزادہ صاحب نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ یوں بھی ٹھنڈی کر کے کھانے کے قائل تھے۔ عمر کی ساٹھ بہاریں گزار چکے تھے اور نجل پر ان کا دل آگیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پلاننگ کر رہے تھے کہ کیسے اس نوخیز حسن کو اپنا بنالیں اور قدرت ان کی پلاننگ پر ہنس رہی تھی۔

''موراں...... موراں کہاں مرگئی ہو، تمہاری چائے ابھی نہیں گلی؟'' شاہجہان کی چیختی آواز سے نجل چونکی اور ہولے، ہولے چلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے لمبی، لمبی سانس لی۔

''کون تھا اس کا باپ؟ کوئی شریف آدمی۔'' شاہجہان سچ کہہ رہی تھی یا جھوٹ لیکن دل پر ایک بوجھ سا آگرا تھا اور پھر شاہجہان کا کیا پتا اتنے فراٹے سے جھوٹ بولتی تھی کہ مقابل کو شک تک نہ ہوتا تھا اور ممکن ہے شاہجہان کو

خود بھی پتا نہ ہو اس کے باپ کا۔ اس نے سوچا اور دل پر دھرا بوجھ بڑھ گیا۔ شاہجہان سے کچھ پوچھنے کا فائدہ بھی نہ تھا وہ بتانے والی بھی نہیں تھی۔

''ایسا شریف زادہ ہوتا تو ساتھ ہی نہ لے جاتا۔ اس دلدل میں کیوں چھوڑ جاتا۔ صحیح تو کہہ رہے تھے صاحبزادہ صاحب۔'' ایک گہری سانس لے کر وہ پورچ میں بکھری دھوپ کو دیکھنے لگی اس سے زیادہ دھوپ تو اس کے اندر بھری تھی جو رگ، رگ کو جھلساتی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی یہاں تک کہ دھوپ اس کے چہرے پر پڑنے لگی لیکن وہ یونہی بے حس سی بیٹھی رہی کہ دل کی زمین۔ دھوپ کی تپش سے سلگ رہی تھی اور کہیں سے کوئی بادل آکر اس جلتی بلتی زمین پر برس کر اسے ٹھنڈک نہیں بخشتا تھا ایک دم ہی گھٹن اور حبس سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اندر شاہجہان اور موتیا غالباً صاحبزادہ صاحب کی خاطر داریوں اور خوشامدوں میں لگی تھیں کہ ابھی تک وہ باہر نہیں آئے تھے۔ اس نے کبھی اپنی زندگی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ وہ مطمئن تھی یا نہیں اس نے کبھی اس پر بھی غور نہیں کیا تھا۔

سنہری کبھی کبھی اسے بے حس کہتی تھی لیکن وہ بے حس تھی یا حد سے زیادہ حقیقت پسند وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ سنہری کی طرح واویلا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سنہری جو کبھی کبھار واویلا کر کے پھر خوش اور مطمئن ہو جاتی تھی۔ وہ شاہجہان بیگم کی بیٹی تھی اور اس حقیقت کو بدلنے پر وہ قادر نہیں تھی۔ اس کا باپ کون تھا اس کے متعلق بھی اس نے زیادہ تجسس نہیں کیا تھا۔ بس اپنے اسکول میں ظہور رے کا نام دیکھ کر پوچھا تھا ایک بار کہ کیا ظہور ا ہی اس کا باپ ہے اور بس بقول سنہری کے وہ بغیر کسی گلے، شکوے کے ایک بے حس زندگی گزار رہی ہے لیکن آج اس کا دل کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ دل پر جیسے آبلے بنتے اور پھوٹتے تھے اور ان پھوٹتے آبلوں کی جلن اور اذیت رگوں کو کاٹتی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کبھی روئی تھی لیکن اس وقت اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ شاید آنسو اس جلن کو کم کر دیں۔ وہ یک دم کھڑی ہو گئی اور گہری گہری سانس لی اور پھر بالکل غیر ارادی طور پر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کھول کر باہر نکل آئی اور سڑک کراس کر کے پارک کی طرف جانے لگی۔ شاید کھلی فضا میں یہ گھٹن کم ہو جائے جو رہ، رہ کر اس کا دم گھونٹتی تھی۔

''کچھ لوگوں پر خدا کتنا مہربان ہوتا ہے۔'' اس نے پارک کی طرف سے آتی خوش باش خاتون کی طرف دیکھا۔ جو ایک پیارے سے بچے کی انگلی پکڑے مسکرا، مسکرا کر بچے سے باتیں کرتی ہوئی اس کے قریب پہنچی تو اس نے غیر ارادی طور پر انگلی سے بچے کے رخسار کو چھوا، عورت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو اس نے بھی مسکرانے کی کوشش میں اپنے ہونٹ پھیلا دیے اور پارک میں داخل ہو گئی۔ یہاں گھنے درخت تھے، سبزہ تھا اور چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے رونق تھی۔ اگرچہ فضا میں دھوپ کی تپش تھی پھر بھی آس پاس کے گھروں کے بچے پارک میں کھیل رہے تھے۔ غبارے، دال سویاں اور قلفی بیچنے والے بھی آوازیں لگاتے پارک میں چکر لگا رہے تھے جبکہ بچوں کے ساتھ آنے والی کچھ خواتین اور مرد حضرات بینچوں پر بیٹھے تھے۔ وہ سر جھکائے کسی تنہا گوشے کی تلاش میں چلتی گئی۔ چلتے، چلتے یک دم کسی کی نظروں کی تپش محسوس کر کے وہ رکی اور اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں طرف درخت کے قریب کٹے ہوئے تنے پر وہ بیٹھا تھا ایسے کٹے ہوئے تنے پارک میں کئی جگہ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے رکھے ہوئے تھے اسے رکتے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

''آپ...... یہاں...... کیسی ہیں آپ؟'' اس کی آنکھوں سے اشتیاق جھلکتا تھا لیکن اس اشتیاق میں نہ تو صاحبزادہ صاحب کی آنکھوں والی حرص تھی نہ بخاری صاحب کی آنکھوں کی ہوس۔ شفاف، بے ریا آنکھیں اپنے اندر شوق کا جہان چھپائے اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''کتنا عجیب اتفاق ہے کہ میں یونہی بلا ارادہ اٹھ کر پارک میں آ گیا تھا...... شاید میرے دل......'' اس نے

زبان دانتوں تلے دبالی۔ ''دراصل بابا اور رواحہ، بابا کے کسی کولیگ کے ہاں گئے ہوئے تھے تعزیت کے لیے اور گھر میں اکیلے بیٹھے، بیٹھے میرا دل گھبرایا تو میں یہاں آ گیا چند بار بابا کے ساتھ صبح، صبح واک کے لیے آیا تھا لیکن آج اس وقت بس یونہی......'' اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا اور وہ بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اس نے گھبرا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''سوری، شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں عظام ہوں آپ اپنی مدر کے ساتھ ہمارے ہاں آئی تھیں۔''

''میں نے پہچان لیا ہے، آپ کیسے ہیں؟'' اس نے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔ اب وہ زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' عظام کی خوشنما آنکھوں میں جگنو سے دمکنے لگے۔ ''بیٹھیں ناں پلیز۔'' اس نے اپنے سامنے پڑے دوسرے تنے کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ بھی غالباً میری طرح تنہائی سے گھبرا کر ادھر چلی آئی ہیں۔''

''نہیں، تنہائی تو نہیں حبس اور گھٹن سے گھبرا کر۔'' اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ اس قدر شاندار وجیہہ شخص اس کے کانوں میں موتیا کی آواز گونجی۔

''سن سنہری یہاں سے جان چھڑانے کے لیے تو بس پھر ایک ہی حل ہے کسی کو پھنسا لے اور گھر بسا لے۔''

''اور اگر میں اسے......'' اور اپنی سوچ پر شرمندہ سی ہو کر وہ اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

''بیٹھ جائیں ناں پلیز۔'' عظام نے پھر تنے کی طرف اشارہ کیا تو وہ بنا کچھ کہے بیٹھ گئی۔

''آپ کیا کھڑے رہیں گے؟'' اس نے پھر ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں اور اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔

''کیا ہے اگر یہ شخص...... ہاں یہ شخص مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے معتبر کر دے۔'' کیا یہ صرف معتبر ہونے کی خواہش تھی یا کچھ اور جذبہ بھی درونِ دل موجود تھا۔ اس سے وہ اس سے بے خبر تھی لیکن کچھ دنوں بعد اس نے جانا تھا کہ اس خواہش کے ساتھ محبت کے رنگ بھی شامل تھے لیکن اس وقت تو صرف معتبر ہونے کی خواہش رہ، رہ کر دل میں چٹکیاں بھرتی تھی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عظام نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

''اس روز آپ کی والدہ نے بتایا تھا کہ آپ نے انٹر کے بعد پڑھائی چھوڑ دی ہے تو پھر سارا دن کیا کرتی رہتی ہیں کوکنگ وغیرہ؟''

''نہیں...... کوکنگ تو موراں کرتی ہے مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ میں سارے فارغ وقت میں کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہوں۔''

''کیسی کتابیں پڑھتی ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''ہر طرح کی جو بھی مل جائیں ناول، افسانے، سفرنامے، سوانح عمریاں کچھ بھی۔''

''کوئی خاص کتاب جو آپ کو پسند ہو؟'' عظام نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پوچھا۔

''کوئی ایک نہیں...... بہت ساری ہیں جو مجھے بہت پسند ہیں۔'' وہ پہلی بار کسی اجنبی سے اس طرح بات کر رہی تھی۔ کیوں کر رہی تھی نہیں جانتی تھی۔ اس کے دل پر بہت بوجھ تھا، یہ بوجھ کیوں تھا وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔ اماں اسے اداکارہ بنانا چاہتی تھی یہ بات بھی وہ پہلے سے جانتی تھی اور موتیا نے کہا تھا یہ اس سے بہت اچھا ہے جو انہیں کرنا پڑتا ہے پھر بھی پتا نہیں کیوں اس کا دل بھر، بھر آ رہا تھا۔ کیا اس لیے کہ صاحبزادہ صاحب نے کہا تھا کہ اگر اس کا باپ ایسا ہی شریف زادہ تھا تو...... اور کیا۔ واقعی اس کا باپ کوئی شریف آدمی تھا یہ سارا بوجھ شاید اس لیے تھا

کہ اسے اپنے باپ کا نام نہیں معلوم تھا اور اس لیے بھی تھا کہ بخاری صاحب اور صاحبزادہ کی نظریں...... اسے لگتا تھا جیسے وہ بیچ چوراہے میں بیٹھی کوئی عورت ہو اور ہر آنے جانے والا اس کا تماشا کر رہا ہو۔ آج سے پہلے تو اسے کبھی اپنا آپ اتنا کمتر اتنا گھٹیا نہیں لگا تھا لیکن آج۔

''آپ نے انٹر کے بعد کیوں چھوڑ دیا؟ مزید کیوں نہیں پڑھا؟'' عظام اس سے کچھ نہ کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اس سے بات کر رہی تھی اس نے ایسا سوچا تو تھا کہ کبھی ایسا ہو کہ وہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کریں لیکن ایسا ہوگا اس کا اسے یقین نہیں تھا لیکن ایسا ہو گیا تھا وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور اس کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

''میری اماں مجھے اداکارہ بنانا چاہتی ہیں۔''

''اور آپ ایکٹنگ پسند نہیں کرتیں؟'' عظام نے پتا نہیں کیسے اندازہ لگایا اس کی نظریں اٹھیں اور پھر کچھ دیر اسی زاویے پر اٹھی رہ گئیں۔

''نہیں۔'' اس نے نگاہیں جھکالیں۔ اس کے ''نہیں'' میں عجیب طرح کی سختی تھی۔

''حالانکہ آج کل تو بہت معزز گھرانوں کی لڑکیاں بھی اداکاری کر رہی ہیں۔ ایک دور تھا شاید جب اسے پسند نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب تو یہ بھی پروفیشن ہے۔ ہماری یونیورسٹی میں ہر چوتھے لڑکے کو اداکار بننے کا کریز ہے جسے دیکھو آڈیشن کے چکر میں پڑا ہے۔'' وہ مسکرایا اس کی مسکراہٹ بہت دلکش تھی اور اس کے دانت بے حد خوب صورت تھے۔

''ہاں لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں کبھی اداکاری نہیں کر سکتی جبکہ میری اماں نے میرے پیدا ہوتے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ مجھے اداکارہ بنائیں گی۔'' وہ ہلکے سے ہنسی لیکن اس کی ہنسی میں بلا کا درد تھا۔ عظام کے دل پر ضرب سی پڑی کیا اس لڑکی کو کوئی دکھ ہے اس نے سوچا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ خالی، خالی نظروں سے عظام کے پیچھے درخت کو دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر جیسے کوئی کرب آ کر ٹھہر گیا تھا۔

''آپ یقیناً بہت خوب صورت اور پیاری ہوں گی تب آپ کی اماں نے سوچا ہوگا کہ آپ کو اداکارہ بنائیں اس وقت عموماً یہی تاثر تھا کہ اداکارائیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔''

''اور کیا میں اب خوب صورت نہیں ہوں؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت کا تاثر ابھرا تھا۔

''آپ......'' اس کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ ''میرے پاس لفظ نہیں اس حسن کو بیان کرنے کے لیے کیا آئینے نے کبھی آپ کو کچھ نہیں بتایا؟''

''آئینے نے...... بہت بار لیکن صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے اور بھی بہت سی وجوہات ہیں۔'' اس کے لہجے میں افسردگی گھل گئی تھی یا اسے محسوس ہوئی تھی۔

''دراصل اس فیلڈ میں پیسہ بھی تو بہت ہے۔ شہرت، عزت، پیسہ شاید اس لیے آپ کی اماں نے ایسا سوچا ہو لیکن اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو انہیں بتا دیں کہ آپ کو نہیں پسند ایکٹنگ کرنا۔''

''ان کے پاس میرے لیے شاید اس سے بہتر چوائس نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے حساب سے تو میرے لیے بہت اچھا سوچا اس سے بہتر جو موتیا اور سنہری کر رہی تھیں۔'' لمحے بھر کے توقف کے بعد وہ کسی اذیت آمیز خیال سے جیسے ڈوب کر ابھری۔

''موتیا اور سنہری میری بڑی بہنیں ہیں اور مجھے تو اس کے لیے اماں کا ممنون ہونا چاہیے لیکن میں شاید ناشکری ہوں۔ میری دوست آمنہ بھی کہتی تھی کہ مجھے ہمیشہ رب کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن میں نے کبھی نہیں کیا۔ یہ نہیں کہ میں

نے کبھی گلہ کیا ہو رب سے۔ شکر ادا نہیں کیا تو کبھی گلہ بھی نہیں کیا لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں شکر ادا کروں کہ اللہ نے مجھے سنہری اور موتیا جیسی بہنیں دی ہیں جو مجھ سے محبت کرتی ہیں حالانکہ میں نے کبھی ان کی محبت کا رسپانس نہیں دیا اور اماں ہیں جنہوں نے ہمیشہ میرا فیور کیا۔ اپنی فطرت کے برخلاف مجھے بچا بچا کر رکھا اور موراں ہے جس کو ہر دم میری فکر رہتی ہے اور میں اللہ سے گلہ کروں...... شکوہ کروں کہ اس نے مجھے......'' اور اسے اپنی سانس سینے میں گھٹتی محسوس ہوئی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ عظام نے ناسمجھی سے اسے دیکھا وہ اس کی بات سمجھ نہیں پایا تھا پھر بھی اس نے کچھ کہنا ضروری سمجھا۔

''ہاں، ہمیں شکر تو ہر وقت ادا کرنا چاہیے۔ میرے پاپا کہتے ہیں کہ بندے پر خالق کا شکر واجب ہے، اس کے اپنے بندوں پر اتنے احسانات ہیں، اتنی رحمتیں ہیں اور اتنی نعمتیں عطا کی ہیں اس نے کہ بندے کو ہر دم اس کا شکر گزار رہنا چاہیے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس نے آپ کو محبت کرنے والے رشتے دیے بلکہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کے لیے آپ کو اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس نے آپ کو آنکھیں دیں دیکھنے کے لیے، ہاتھ پاؤں عطا کیے، سمجھ اور عقل دی اور پھر بہت ساری نعمتیں ہوا، پانی، پھل بندہ تو کبھی اپنے خالق کا شکر ادا نہیں کر پاتا، ساری زندگی ادا کرتا رہے تب بھی نہیں......'' وہ سر جھکائے اس کی بات سن رہی تھی اس نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور دھیمے سے مسکرایا۔

''اور گلہ...... اور مخلوق کو گلہ کرنا تو بنتا ہی نہیں پگل...... ہاں اسے صبر اور دعا کرنی چاہیے۔''

''صبر اور دعا۔'' صبر تو اس نے ہمیشہ ہی کیا تھا لیکن دعا...... دعا کبھی نہیں کی تھی۔

''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے کبھی دے کر، کبھی لے کر۔''

''ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس نے نظریں اٹھائیں عظام اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی دلاسا دیتی، تسلی دیتی ہوئی مسکراہٹ......

''ویسے......'' اسے اپنی طرف تکتا پا کر عظام نے کہا۔ ''ایکٹر بننا ایسا برا تو نہیں جو آپ اتنی اپ سیٹ ہو رہی ہیں۔''

''ہاں شاید اتنا برا نہیں...... لیکن میں کیا کروں میں اداکاری نہیں کر سکتی۔'' اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ بات صرف اداکاری کی نہیں تھی۔ کوئی اور بھی دکھ تھا جو چپکے، چپکے اسے کاٹ رہا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کی تھی اور زندگی میں پہلی بار وہ کسی اجنبی سے دل کی بات کر رہی تھی۔ وہ اجنبی ہی تو تھا بھلا دو تین بار صرف دیکھنے سے کوئی اجنبی اپنا تو نہیں بن جاتا ناں۔

اس نے تو کبھی موتیا، سنہری اور اماں کو بھی اپنے دل کا بھید نہیں دیا تھا اور اب وہ اس سے اس پہلی ملاقات میں ہی سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ کچھ چھپانا نہیں چاہتی تھی وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کیوں ایسا کر رہی تھی لیکن وہ ایسا کر رہی تھی۔

''آپ نے پوچھا نہیں موتیا اور سنہری کیا کرتی ہیں؟'' اس نے جیسے کرب کے سمندر سے ابھر کر عظام کی طرف دیکھا۔ ''وہ ناچتی گاتی اور محفل سجاتی ہیں اور......'' ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے گلاب لبوں پر تھرائی۔

''اور میری اماں...... بلکہ ہم سب یہاں آنے سے پہلے لاہور کے شاہی محلے میں رہتے تھے گلبرگ میں نہیں۔'' آنسو یک دم ہی اس کی آنکھوں کی سطح پر چمکے اور پھر جیسے بند توڑ کر رخساروں پر پھسل آئے۔

عظام نے تڑپ کر اسے دیکھا اور حیرت سے سوچا کہ اگر وہ گلبرگ کے بجائے شاہی محلے میں رہتی ہے تو اس میں رونے کی کیا بات ہے پھر یک دم ہی اس کے اندر کچھ کلک ہوا اس نے ایک بار ایک مضمون پڑھا تھا کسی سنڈے میگزین میں شاہی محلے کے بارے میں اور اس کی حیرت، تاسف میں بدل گئی لیکن نہیں...... شاید میں کچھ بھول رہا

ہوں اس نے اس کے شفاف پاکیزہ چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس لیے رو رہی تھی کہ وہ شاہجہان بیگم کی بیٹی ہے اور اس کا ہر آنسو عظام کے دل پر آتشیں سیال بن کر گر رہا تھا۔

''آپ پلیز مت روئیں، کیا آپ صرف اس بات پر رو رہی ہیں کہ آپ کی اماں آپ کو اداکارہ بنانا چاہتی ہیں یا اس لیے کہ آپ کی اماں گلبرگ کے بجائے شاہی محلے میں رہتی تھیں؟''

''آپ کو پتا ہے شاہی محلے میں رہنے والی عورتیں کون ہوتی ہیں؟ معاشرہ انہیں کس نام سے پکارتا ہے؟'' اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

''اوہ...... ہاں۔'' وہ چونکا اور شرمندہ ہو گیا وہ مضمون پوری جزئیات کے ساتھ اسے یاد آ گیا تھا۔

''مجھے اپنے باپ کا نام نہیں معلوم کیا مجھے اس بات پر خوش ہونا چاہیے؟'' اس کے لہجے سے ناراضی جھلکنے لگی تھی اور وہ بے حد خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں۔'' وہ ہڑبڑایا۔ ''لیکن آپ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزار سکتی ہیں اپنی والدہ کو قائل کر سکتی ہیں۔''

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' اس کی آنکھوں کے سامنے کئی منظر آ گئے جب وہ چھوٹی تھی تو اماں غلط پاؤں اٹھانے پر کیسے دھنک کر رکھ دیتی تھیں۔ اماں نے اگر ساری زندگی اسے اس ماحول سے الگ رکھا تھا تو اس کا پس منظر یقیناً کچھ اور تھا اس کے باپ سے کیا وعدہ...... یا شاید اماں کو اس کے باپ سے محبت ہو گئی ہو یا...... اس نے شاکی نظروں سے عظام کو دیکھا۔

''ساحل پر کھڑا شخص سمندر میں ڈوبتے ہوئے شخص کی اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتا جو وہ بپھری ہوئی موجوں سے لڑتے ہوئے برداشت کر رہا ہوتا ہے۔''

''سوری۔'' عظام مزید شرمندہ ہوا۔

''آپ اس اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتے جس سے ہمیں گزرنا پڑتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے سنہری کو پنجرے میں بند پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے۔ آزادی کے خواب دیکھتے اور پھر اپنی قید پر قانع ہوتے ہوئے۔ قناعت کی وہ بے بسی آپ محسوس نہیں کر سکتے۔''

''میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں نجل، آپ مجھے بتائیں؟'' اس نے دلگرفتگی سے پوچھا۔

وہ لمحہ بھر یونہی عظام کی طرف دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں میں نجل کا درد اتر آیا تھا۔ موتیا کہتی تھی۔

''سنہری تم کتنی بھی کوشش کر ڈالو کسی کو اپنی محبت کے جال میں گرفتار کر لو لیکن اسے جب تمہاری حقیقت معلوم ہو گی تو بھاگ جائے گا۔''

اس نے تو آگے بڑھنے سے پہلے ہی، پہلے قدم پر ہی حقیقت کھول دی تھی۔ پتا نہیں صحیح کیا تھا یا غلط...... اور سنہری کہتی تھی کہ اگر سچ مچ اسے مجھ سے محبت ہوئی تو وہ نہیں بھاگے گا۔

وہ کم عمر تھی، تجربہ کار نہیں تھی لیکن کتابوں نے اسے اپنی عمر سے بڑا کر دیا تھا۔ اس نے عظام کی آنکھوں میں وہ جذبہ دیکھا تو جو محبت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور جو جب عشق میں ڈھلتا ہے تو پھر آتشِ نمرود میں بے خبر کود پڑتا ہے۔

''کیا آپ واقعی میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں؟'' اس نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں...... آپ کہیں تو۔'' عظام نے اس کے بھیگے رخساروں سے بمشکل نظر ہٹائی۔

''تو آپ مجھ سے شادی کر لیں۔'' اس نے ایک بار ہی چھلانگ لگا دی آر یا پار۔ عظام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ لڑکی جو پہلی نظر میں ہی اسے دل میں اترتی محسوس ہوئی تھی اور دوسری بار

جب اس نے اسے دیکھا تھا تو رات اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ محبت صدیوں کا عمل نہیں ہے بلکہ یہ تو لمحوں میں طے پاجاتا ہے اور اسے اس اجنبی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی اور آج اس پہلی ملاقات میں وہ کیا کہہ رہی تھی اسے لگا جیسے اس کی سماعتوں نے غلط سنا ہو بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے اسے جانے بغیر وہ اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتی ہے۔

اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ موتیا نے سچ ہی تو کہا تھا سنہری سے کہ تمہاری حقیقت جاننے کے بعد وہ تمہاری طرف مڑ کر دیکھے گا بھی نہیں اور یہ اس کے سامنے بیٹھا لڑکا اپنی خوشنما آنکھوں میں حیرت لیے اسے تکتا ہوا۔ اس نے تو اس سے محبت کا کوئی ایسا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے بس اپنی نظر پر بھروسا کیا تھا۔ وہ نظر جس نے اس کی آنکھوں میں ایک لو جلتی دیکھی تھی اور اس نے پہلی منزل پر ہی اسے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اسے انتظار کرنا چاہیے تھا جب لو بھڑک کر شعلہ بن جاتی اور آتشِ نمرود میں بے دھڑک کودتے ہوئے خوف نہ آتا لیکن وہ تو ایک ہی بار پل صراط سے گزر جانا چاہتی تھی۔

اس کی آنکھوں کے کنارے پھر سے بھیگنے لگے جو ہوا سو ہوا وہ خلا میں مسلسل لٹکے رہنے کی اذیت سے تو بچ گئی تھی۔ یہ ہاں اور نہ کے درمیان کی اذیت سے یہ اذیت یقیناً کم ہوگی جو اس وقت اسے ہو رہی تھی۔ وہ یک دم کھڑی ہوگئی اور ساکت بیٹھے عظام پر ایک طنزیہ نظر ڈالی اور واپس مڑی۔

''کیا تھا اگر یہ شخص اس سے شادی کرلیتا جو اسے اتنی محبت سے تکتا تھا کہ مبہوت ہوجاتا تھا۔ وہ معتبر ہوجاتی۔ وہ صرف شاہجہان کی بیٹی نہ رہتی بھلے پھر اسے اپنے باپ کا نام معلوم ہوتا یا نہ ہوتا وہ نجل زریں ہوتی زوجہ عظام حیات...... مسز عظام۔'' آنسوؤں سے اس کا حلق نمکین ہو رہا تھا اور وہ پلکیں جھپک، جھپک کر انہیں باہر آنے سے روک رہی تھی۔ وہ تیز، تیز چلتی ہوئی پارک کے گیٹ کی طرف جارہی تھی۔ عظام جیسے کسی نیند سے چونکا اور تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

''سنو نجل...... سنو...... رکو۔'' لیکن وہ مڑی نہیں یوں ہی ہولے، ہولے چلتی رہی۔ باجود کوشش کے آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں سے بہنے لگے تھے۔ عظام تیز، تیز چلتا ہوا اس کے قریب آگیا تھا اور اب اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔

''سنو...... مجھے تم سے شادی میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں اور تم کیا جانو تم سے شادی کرنا زندگی کی معراج کو پالینا ہے میرے لیے۔'' وہ تیز، تیز بول رہا تھا۔ ''میری مدر نہیں ہیں اور میرے پاپا ملک سے باہر ہیں۔ تم مجھے اتنا سا تو وقت دوگی نا بل کہ وہ آجائیں اور میں انہیں تمہارے گھر بھیجوں؟'' وہ بے اختیاری میں آپ سے تم پر آگیا تھا اس کے چلتے قدم رک گئے اور اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے جھوٹ کو جانچنے کی کوشش کی۔

''تمہارے پاپا......؟'' اور عظام جیسے سمجھ گیا۔

''تم جن سے ملی تھیں وہ میرے پاپا نہیں تھے رواحہ کے بابا ہیں لیکن میں انہیں بابا ہی کہتا ہوں۔ میں آج ہی پاپا سے بات کرتا ہوں...... اگر وہ خود نہ آسکے جلدی تو میں ان سے اجازت لے کر بابا کو بھیج دوں گا آپ کے گھر۔'' وہ پھر چلنے لگی تھی عظام اس کے ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔

''آپ...... آپ پلیز مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔ آپ اس طرح اچانک اٹھ کر چلی آئیں تو مجھے لگا جیسے آپ مجھ سے بدگمان ہوگئی ہیں۔'' وہ پھر تم سے آپ پر آگیا۔

''آپ اس طرح سوچ میں پڑ گئے تو میں نے سوچا کہ آدمی سوچ میں تب پڑتا ہے جب وہ سود و زیاں کا حساب کرنے لگتا ہے تو پھر عقل نے تو زیاں ہی زیاں بتانا تھا۔''

''نہیں...... نہیں میں سودوزیاں کا حساب تو نہیں لگا رہا تھا مجھ پر تو شادیٔ مرگ طاری ہوگئی تھی۔ مجھے تو اپنی سماعتوں پر اعتبار کرنے میں وقت لگا۔ میں نے تو جب پہلی بار آپ کو دیکھا تھا تو دل نے آپ کی عمر بھر کی رفاقت کی چاہ کی تھی۔ یقین کریں آپ تو تب سے ہی میرے دل میں دھرنا دیے بیٹھی ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ آپ کا خیال دل سے نکل جائے لیکن نہیں نکل سکا۔'' عظام کا لہجہ خوشگوار تھا اور وہ اس کے ساتھ، ساتھ چلتا ہوا کہہ رہا تھا۔

پورے پارک میں دھوپ بھری تھی اور سجل کو یہ دھوپ اور گرمی بیزار نہیں کر رہی تھی اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے وجود پر ٹھنڈی، ٹھنڈی پھوار گر رہی ہو۔ ایک خوشگوار سی خنکی اور ٹھنڈک اس کے اندر اتر آئی تھی اور اس کے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے اسے اپنا آپ معتبر لگا اور اس نے دل ہی دل میں اس ساتھ کے دائمی ہونے کی دعا کی اور وہ زندگی میں پہلی بار دعا کر رہی تھی۔ اس شخص کے ہمیشہ کے ساتھ کی جو آج سے پہلے تک تقریباً اس کے لیے اجنبی ہی تھا۔ اپنی دعا کی قبولیت کا یقین خود بخود ہی الہام بن کر اس کے دل میں اترا تھا تو دوپہر کا ویران سناٹا اس کے لیے صبح کی خوشگوار خنکی میں بدل گیا اور اس کے سپاٹ چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔ اس نے محجوب سی نظر اس پر ڈالی۔

''آپ کو لگا ہوگا میں پتا نہیں کیسی ہوں شاید بہت بے باک......''

''نہیں۔'' عظام نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں نے سمندر میں چھلانگ لگا کر ڈوبتے شخص کو سمندر کی موجوں سے نبرد آزما ہوتے محسوس کیا اور اس کی اذیت و کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ یہ بے باکی نہیں بلکہ اپنے حالات سے نکلنے کی ایک کوشش تھی، ڈوبتا ہوا شخص ایک تنکے کا سہارا بھی لے لیتا ہے۔ میں آپ کے لیے وہ تنکا سہی لیکن آپ میرے لیے بہت اہم ہیں...... میرے دل کی اولین خواہش۔''

''نہیں......؟'' سجل اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی اس کے لیے بہت اہم ہے اور یہ کہ اس نے بھی اسے دیکھنے کے بعد راتوں کو سوچا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اس سے یہ سب نہ کہہ پاتی۔ وہ تو محض کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے نکلی تھی لیکن وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی اور اس نے اپنے بھیگے رخساروں کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔

شاید یہ سنہری کے دیکھے گئے خواب اور باتوں کا اثر تھا یا اپنے حالات سے فرار کی کوشش...... کچھ بھی تھا لیکن اسے عظام کے ساتھ چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ واقعی محبت صدیوں کا عمل نہیں یہ تو لمحوں کی بات ہے اور اس کے دل میں بھی عظام کی محبت نمو پا رہی تھی۔

وہ دونوں پارک سے نکل کر روڈ پر آگئے تھے۔ اپنے، اپنے خیالات میں گم دونوں ساتھ، ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ سجل کا گھر آ گیا۔ عظام چونکا وہ اپنے گھر والی روڈ پر جانے کے بجائے سجل کے ساتھ ہی آ گیا تھا اور ٹیرس سے سنہری نے اسے عظام کے ساتھ آتے دیکھا پہلے تو اس کی آنکھیں پھیلیں پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی موتیا کے کمرے کی طرف بھاگی اور سجل نے عین اسی وقت اوپر دیکھا اور اسے سنہری کا سبز آنچل نظر آیا تو کچھ سوچتے ہوئے اس نے عظام کو اپنے ساتھ اندر آنے کی دعوت دی۔

''آیئے ناں...... اماں سے مل لیں۔''

''کیا مناسب ہوگا میرا اس طرح آنا؟'' عظام جھجکا۔

''نامناسب بھی نہیں ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''ہاں اگر لاہور کے شاہی محلے والا گھر ہوتا تو میں کبھی آپ کو آنے کو نہ کہتی۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' عظام ٹپٹایا اور اس کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بہت دیر سے کتاب کھولے بیٹھے تھے لیکن ابھی تک دو صفحے بھی نہیں پڑھ پائے

تھے بار، بار ایک ہی صفحے کو پڑھتے لیکن کوئی بھی لفظ ذہن میں ٹکنے نہ پاتا۔ تنگ آ کر انہوں نے تکیے کے پاس کتاب یونہی اوندھی کر کے رکھ دی دل جیسے کسی پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ''عمر کی نقدی ختم ہوتی جا رہی ہے کاش...... اے کاش ایک بار صرف ایک بار......'' لیکن وہ جو ایک ننھی سی امید کی کرن نظر آئی تھی اس کو آج انہوں نے خود ہی بجھا دیا تھا۔ بہت درد...... بہت گہرا درد جیسے ان کے دل کو چھیلنے لگا اور اس درد کو برداشت کرنے کے لیے انہوں نے آنکھیں زور سے بند کر لیں اور لب بھینچے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔

آج سنڈے تھا اور انہیں اپنے ایک کولیگ گل اختر صاحب کے ہاں ان کے سسر کی تعزیت کے لیے جانا تھا۔ وہ تیار ہو کر لاؤنج میں آئے تو رواحہ اور عظام لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کا جی چاہا کہ وہ رواحہ سے کہیں کہ وہ ان کے ساتھ چلے، پتا نہیں کیوں انہیں لگ رہا تھا کہ وہ ڈرائیو نہیں کر پائیں گے۔ بڑی کمزوری اور نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کئی دنوں سے وہ صحیح طرح سے سو نہیں سکے تھے شاید اس وجہ سے یا شاید ان رتجگوں میں کرلا دینے والی ماضی کی یادوں نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔

''بابا آپ کہیں جا رہے ہیں؟'' رواحہ نے ان سے پوچھا اور ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر دوبارہ کہا۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

انہوں نے سر ہلایا تھا۔

''نہیں، مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' وہ خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور انہیں بہت دھیان سے دیکھ رہا تھا۔

''وہم ہے تمہارا۔'' وہ مسکرائے تھے۔

''آپ کا جانا ضروری ہے بابا؟'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''گل صاحب کے سسر کا افسوس کرنے جانا ہے والد کی طرح ہی تھے ان کے لیے سب کولیگ ہو آئے ہیں، میں ہی رہ گیا ہوں۔''

''تو ایک منٹ رکیں بابا، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' انہوں نے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔ جیسے دل کے تار دل سے جڑے تھے۔ رواحہ نے ان کے دل کی خواہش جان لی تھی۔ وہ عظام سے کچھ کہتا ہوا ان کے ساتھ ہی لاؤنج سے نکلا تھا۔ پورچ کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

''میرا جی چاہ رہا تھا رواحہ کہ تم ڈرائیو کرو۔ پتا نہیں کیوں آج ہمت نہیں ہو رہی تھی۔''

''بابا۔'' اس نے گاڑی کی چابی ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''پھر آپ نے مجھے کہا کیوں نہیں؟ کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں، کیا آپ کو کہنا نہیں چاہیے تھا کہ رواحہ بیٹا آج تم میرے ساتھ چلو...... بابا آپ......'' وہ بے حد خفا، خفا سا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

''میری جان۔'' انہوں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''میں نے عظام کے خیال سے نہیں کہا۔''

''میں بیٹا ہوں آپ کا بابا۔ ساری زندگی آپ نے میرا خیال رکھا...... ماں کی کمی محسوس ہونے نہیں دی، میری ذرا سی تکلیف پر آپ تڑپے، کیا میرا فرض نہیں بنتا کہ میں آپ کے لیے کچھ کروں آپ حکم دیا کریں بابا۔'' وہ بدستور خفگی سے کہہ رہا تھا۔ ''میرا تو دل چاہتا ہے کہ آپ تھکے ہوئے آئیں تو میں آپ کی ٹانگیں دباؤں آپ کے پاؤں دباؤں...... بابا میں آپ کو سکھ دینا چاہتا ہوں۔ آرام پہنچانا چاہتا ہوں۔'' اس کی آواز بھر آگئی تھی۔

''تمہیں کیا خبر رواحہ میری جان کہ تمہارا ہونا ہی میرے لیے کتنے سکھ اور سکون کا باعث ہے تم نہ ہوتے تو شاید

تمہارا ابا باجی نہ پاتا۔'' انہوں نے دل ہی دل میں کہا اور ہولے سے ہنسے۔

'' پگلے میری ٹانگوں اور پاؤں میں درد نہ ہو تو پھر بھی۔''

'' میرا جی چاہتا ہے ناں بابا کہ میں آپ کی خدمت کروں۔'' اس نے ذرا سا رخ موڑ کر انہیں دیکھا تھا اب اس کی خوشنما آنکھوں سے ناراضی نہیں محبت اور پیار جھلکتا تھا۔ اس کی اس محبت پر جیسے ان کا دل پگھل کر پانی ہونے لگا بے اختیار ان کا جی چاہا کہ وہ اسے سینے سے لگا کر اس کے جوان جسم کی حرارت سے اپنے کمزور پڑتے جسم کو سہارا دیں لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے اس کے اسٹیئرنگ پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

'' میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے کہ اللہ نے تمہیں مجھے دیا۔ تم میرا فخر ہو میرا مان ہو۔''

'' بابا۔'' رواحہ خوش ہونے کے بجائے تشویش سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔'' بابا آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، گل صاحب کے ہاں جانے کے بجائے پہلے اسپتال چلتے ہیں اس وقت ڈاکٹر شہریار اسپتال میں ہی ہوں گے ناں۔''

'' ارے نہیں میری جان! اب ایسا بھی بیمار نہیں ہوں بس ذرا سستی ہو رہی ہے۔''

'' مجھے لگتا ہے آپ باقاعدگی سے دوا نہیں کھا رہے۔''

'' یار کھاتا تو ہوں صبح شام مٹھی بھر دوائیں۔''

'' آپ جانتے ہیں ناں بابا میں آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ آپ ہیں تو میں ہوں۔'' اس نے کئی بار کی کہی بات دہرائی تھی اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہولے، ہولے اس کا بازو تھپتھپاتے رہے۔

'' گل صاحب کے ہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے بابا اور وہاں سے سیدھا اسپتال جائیں گے۔''

'' او کے یار لے جانا ڈاکٹر کے پاس۔'' انہوں نے کہا تو اس کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا تھا اور پھر ان کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ انہیں اسپتال لے گیا تھا۔ ڈاکٹر شہریار اس وقت اسپتال میں بیٹھتے تھے اور شام میں اپنے کلینک میں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر شہریار تب سے ہی ان کے معالج تھے جب انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔

'' کیا آپ کو آج کل کوئی ٹینشن ہے کوئی پریشانی......؟'' ان کا بی پی چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر شہریار نے پوچھا تھا۔

'' نہیں تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔''

'' میں نے پہلے بھی کہا تھا ایک بار انجیو گرافی کروالیں اب بھی یہی مشورہ دوں گا اور پلیز اپنے آپ کو ہر پریشانی سے دور رکھیں۔''

'' بابا آپ کو کیا پریشانی ہے؟'' ڈاکٹر شہریار کے کمرے سے باہر نکلتے ہی رواحہ نے پوچھا تھا۔

'' مجھے کوئی پریشانی نہیں میری جان۔''

'' پھر آپ کا بی پی اتنا ہائی کیوں ہے؟'' وہ تشویش سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

'' یار ہو جاتا ہے کبھی کبھی ہائی...... عمر کا تقاضا ہے جب ڈاکٹروں کو کچھ سمجھ نہ آئے تو وہ بس یونہی کہہ دیتے ہیں کہ ٹینشن ہے پریشانی ہے۔''

'' لیکن بابا ڈاکٹر شہریار صحیح کہتے ہیں ایک بار انجیو گرافی کروالیں پتا چل جائے گا کہ وینز......'' وہ باتیں کرتے، کرتے اسپتال سے باہر نکل رہے تھے جب انہوں نے اسے دیکھا وہ ایک اسٹریچر کے پاس جھکی اسٹریچر پر لیٹے مریض سے کچھ کہہ رہی تھی وہ رواحہ کی پوری بات سنے بغیر تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔

جاری ہے

’’آپی کیا ہوا......؟ آپی میں پریکٹیکل نوٹ بک تیار کر رہی تھی، آپی لائٹ کیوں آف کی ہے؟‘‘

مگر تین چار کے بجائے وہ تین چار ہزار سوال بھی کرتی تو عینی نے چپ ہی رہنا تھا...... اب تو کیا میکا اور کیا سسرال ایک، ایک کو پتا چل گیا تھا کہ عینی بی بی کا موڈ کب خراب ہوتا ہے، کب وہ بولنا بند کرتی ہیں۔

سو اس وقت فروہ جانتی تھی کہ پس منظر بھی وہی مسئلہ ہے اور پیش منظر بھی...... اولاد نہ ہونے کا دکھ...... سات سال، تین ماہ اور پچیس دن کم تو نہیں ہوتے...... پہلے یقینِ کامل تھا کہ شادی کی سالگرہ بعد میں اور بچے کی آمد پہلے ہی ہوگی...... کتنے ہی لوگ اس کے اردگرد بستے تھے جن کا پورا ریکارڈ اس کے پاس موجود تھا...... فائزہ کی شادی کراچی میں ہوئی تھی...... اس کی چچا زاد بہن، کہاں چکوال اور کہاں کراچی...... ولیمے کے بعد جب وہ آئی تو ناک پر دوپٹا رکھا ہوا تھا...... ہر چیز میں بساند سے طبیعت کی خرابی کی کارونا روتے، روتے واپس چلی گئی اور شادی کے آٹھ ماہ چار دن کے بعد گل تھوتھنے سے صاحبزادے کی اماں بن چکی تھی۔

اس کی کلاس فیلو ملاحت آخری پیپر دے کر گھر پہنچی تو مایوں مہندی کی تیاریاں تھیں...... بی ایس سی کا رزلٹ آیا تو دوسرا رزلٹ بھی مل چکا تھا...... یعنی پازیٹو رپورٹ والا......

اللہ...... دو ماہ سے دو سال گزر گئے مگر کوئی دل خوش کن خبر نہ تھی...... شادی کے تیسرے سال یقینِ کامل، یقین پھر چوتھے سال آس، امید اور ساتویں سال مایوسی، محرومی، ڈپریشن میں بدل گیا۔

بن پوچھے ہی فروہ جانتی تھی کہ کہانی میں موضوع وہی ہوگا...... بے اولادی...... یا بانجھ پن......

فروہ سوائے دعا اور کندھے اچکانے کے کیا کر سکتی تھی...... اس نے دل ہی دل میں اس کے لیے دعا مانگی اور پریکٹیکل نوٹ بک بنانے کے...... اپنے پروگرام پر فاتحہ پڑھ کر وہ بھی لیٹ گئی۔ کبھی کبھار عینی کی سسکیوں اور ہچکیوں سے آنکھ کھل جاتی تو دل بڑا خراب ہوتا۔

فروہ فجر کی نماز کے لیے اٹھی تو عینی کی سوجی آنکھیں، بھاری آواز شبِ گزشتہ کی روداد سنا رہی تھیں۔ تھی تو وہ چھوٹی لیکن ہمت کر کے اس نے عینی سے کہہ ہی دیا۔

’’عینی آپی آپ کسی کا بچہ ایڈاپٹ کر لیں۔‘‘

’’وہ کیوں...... نہیں...... بالکل نہیں۔ اگر خدا مجھے دینا نہیں چاہتا تو میں کسی سے بھیک کیوں لوں......‘‘ اس نے فروہ کا فقرہ کاٹتے ہوئے کہا۔

’’عینی آپی، اس طرح تو آپ نفسیاتی مریضہ بن جائیں گی، دنیا میں بہت سے لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی، وہ ایسے روگ تو نہیں لگاتے جیسے آپ نے لگالیا ہے۔ کہیں جاتی ہیں نہ کسی کو بلاتی ہیں۔ آپ ایسے نہ کریں، اللہ جی آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔‘‘

’’تو اب کون سا راضی ہیں۔‘‘ جلے کٹے لہجے میں عینی نے کہا۔

’’عینی آپی......‘‘ فروہ نے قدرے غصے سے کہا۔ ’’اللہ جی اتنی جلدی کسی سے ناراض نہیں ہوتے۔‘‘

’’اگر راضی ہیں تو میری مراد پوری کریں، میری دعائیں قبول کریں، مجھے بچے دیں، ایک دو تین چار...... بھلے ہر سال دیں، جڑواں دیں، تڑوا دیں۔ دیں تو سہی...... دیں تو سہی۔‘‘ عینی بلک رہی تھی، رو رہی تھی ہسٹریا کی مریض بن گئی تھی۔ روتے، چیختے بے دم ہو کر بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔

☆☆☆

ہواؤں کی سختی، نرمی اور لطافت میں بدل گئی...... آگ اگلتا قہر برساتا سورج دھوپ چھاؤں کے کھیل میں مگن تھا...... ہر چیز عینی کو اٹکھیلیاں کرتی محسوس ہو رہی تھی...... پتے جھولتے تو عینی بھی سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ کر جھومنے لگ جاتی...... کوئل کوکتی تو عینی بھی اللہ ہو، اللہ ہو کے ترانے شروع

کر دیتی...... اس کی زندگی سے خزاں رخصت ہو گئی تھی۔ بہار...... سدا بہار بن کر اس کی زندگی کو گل و گلزار کر چکی تھی۔

ناممکن، ممکن ہو گیا...... دعائیں قبول ہو گئیں اسے مستجاب الدعوات ہونے کا شرف مل گیا تھا۔

اِدھر سورج طلوع ہوتے وقت جھلک دکھاتا اُدھر غروب ہو جاتا...... دن اتنی تیزی سے گزر رہے تھے کہ اسے حیرانی ہوتی۔ پچھلے سال اسی موسم میں یہ دن کاٹے نہ کٹتے تھے...... لگتا تھا گھڑی کی سوئیاں اس کے غم میں ساکت ہو چکی ہیں، وقت کی رفتار مدھم ہو چکی ہے...... کوئل کے ترانوں میں بھی اسے آنسوؤں کی نمی محسوس ہوتی...... ’’کیا ایک ہستی کی آمد کی خبر سے کائنات کی ہر چیز متاثر ہو جاتی ہے۔‘‘ اپنے سوال کا جواب، ہاں میں پا کر وہ دانتوں تلے انگلی دبا لیتی اور حیرانی سے کہتی ’’واقعی......؟‘‘

جب شادی کو ساڑھے آٹھ سال پورے ہوئے تو عبدالحنان سب کے دلوں کا محبوب بن کر اس کی گود میں آ چکا تھا۔ نیپی، فیڈر سے لے کر کان صاف کرنے والی، کاٹن بڈز تک اور ویٹ ٹشوز سے باکسنگ کریڈل پرام تک بچے کی آمد سے پہلے موجود تھے۔

آنے والے آتے، تحفے تحائف سے زیادہ خوشیوں بھرے کھنکتے لہجوں کے ساتھ، عینی نے بھی کمی نہیں چھوڑی، دونوں ہاتھوں سے لٹایا...... اگر مائیوں، دائیوں کو بے بہا دیا، مٹھی چاپی کرنے والوں کو مالا مال کیا تو بہنیں، بھانجیاں، بھابھیاں، بھتیجیاں، نندیں، دیورانیاں، جیٹھانیاں بھی اس کے قیمتی تحائف سے لدی پھندی واپس گئیں...... بچہ دو اڑھائی ماہ کا ہوا تو اس نے دوسروں کو پکڑانا شروع کیا...... وجہ دوسروں پر عدم اعتماد نہیں بلکہ وہ جان لیوا تکلیف تھی جس میں بچے کی پیدائش کے بعد وہ مبتلا رہی...... ویسے تو ہر عورت کا ہی دورانِ زچگی کفن سرہانے کے نیچے دھرا ہوتا ہے۔ ہر عورت ہی اوپر سے ہو کر نیچے آتی ہے اور بچے کو جنم دیتی ہے۔ لیکن

عینی کے ساتھ کچھ نہیں سب کچھ انوکھا ہوا...... حکم ربی ہوتو اناڑی بھی بہترین کارکردگی کا سرٹیفکیٹ لے سکتے ہیں...... بس ایک چھوٹی سی غلطی سے گیس بگڑ گیا اور آپریشن کے دوران اس کے جسم نے بے قابو ہوکر ہر بند مسام سے نکلنا چاہا......

تین دن زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں ...... موندلیں ...... پھر کھولیں...... دائیں بائیں دیکھ کر بند کرلیں...... تیسری دفعہ آنکھیں کھلیں تو سرجن کے الفاظ اس کے کانوں میں سنائی دیے۔

''اب یہ مکمل طور پر ہوش میں ہیں...... اللہ نے انہیں نئی زندگی عطا کی ہے۔''

سو، عینی کی بھی نئی زندگی تھی اور اس کے بچے عبدالحنان کی بھی...... ابھی اس نے ڈھنگ سے پپی لگانا، فیڈر بنانا نہ سیکھا تھا کہ ایک اور ذی روح کی خبر مل گئی...... ارے اتنی جلدی...... ؟ ابھی تو حنان ساڑھے چار ماہ کا ہوا ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا...... لیکن اس نے آنے والے مہمان کو بھی بہت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا...... تاہم وہ خود جانتی تھی کہ اس دفعہ کے احساسات، کیفیات اور جذبات میں وہ شدت نہیں جو پہلی دفعہ تھی۔ پہلے بچے کی دفعہ تو وہ دن میں دس دفعہ آنے والے کی شکل، صورت اور ناموں کا سوچتی تھی...... لڑکا ہوا تو کون، کون سے نام زیرِ غور ہوں گے اور لڑکی ہونے کی صورت میں کون سے نام...... عقیقے کی رسم پر کس، کس کو مدعو کرنا ہے، کس، کس کو فون کرکے خود خوشخبری دینی ہے کن لوگوں کے ہاں مٹھائی بھجوانا ہے۔

اس دفعہ باقی سب باتیں تو دور کی بات یہ بھی نہ سوچا گیا کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی...... سارا دن حنان کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی گزر جاتا...... اپنا ہی ہوش نہ رہا...... سوتے میں بھی جاگتی رہی اور جاگتے میں بھی سوئی ہوئی پائی جاتی...... ایک وجود کو پال رہی تھی دوسرا پل رہا تھا...... زندگی تن آسانی سے مشقت کی پُرخار راہوں میں چل نکلی تھی...... لیکن جتنی بھی تنگی ہو، جتنی بھی مشقت ہو، خواہ کتنی ہی نیندیں اور آرام تج دینا پڑے ایک سوچ، ایک خیال ایک امید چہرہ پُرنور کردیتی...... جنت ایسے ہی تو پاؤں کے نیچے نہیں آجاتی ناں...... پھر سے تازہ دم ہوجاتی...... اور...

شکر خدا کا اس دفعہ حالات قابو میں رہے عبدالحنان کی چھ ساڑھے چھ پونڈ وزن کی بہن دنیا میں آئی تو وہ ہوش وحواس میں ہی تھی اوپر والے کا کرم ہی کرم رہا کہ وہ پچھلی دفعہ جن حالات سے گزری تھی اس دفعہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہ تھا۔

بیٹے کے بعد بیٹی کی محبت، چاہت اور مصروفیت نے اسے دنیا و مافیہا سے بیگانہ کردیا تھا...... جڑواں بچے ہوں تو دنیا والے تعاون کی.... ہی پیشکش کردیتے ہیں لیکن کون جانے ایک سال میں پیدا ہونے والے دو بچے پالنا جڑواں بچوں سے کتنا مشکل ہوتا ہے۔

ویسے بھی بچے اور بچی ہر دو کی عادات میں بہت فرق تھا...... ایک ہر وقت فیڈر کی طلب میں رہتا، دوسری فیڈر کو منہ میں لینا گوارا نہ کرتی...... ایک کو ہر گھنٹے بعد پمپر، پپی بدلوانے کی عادت تھی دوسری کئی، کئی گھنٹے گزار لیتی...... ایک روتا تو روئے چلا جاتا، نیلا پڑ جاتا دوسری رونے کے لیے منہ کھولتی اور گدگدی پر کھلکھلانے لگ جاتی۔ بس وہ تو انہی دو بچوں کی ہوکر رہ گئی۔ ساس قریبی گلی میں رہتی تھیں، میکا چند منٹ کے فاصلے پر تھا لیکن کئی، کئی ہفتے بیت جاتے وہ گھر سے قدم نہ نکال پاتی...... بیٹی کا نام اس نے انیسہ رکھا تھا...... انیسہ کو کئی دن سے سینے میں انفیکشن تھا...... بلغم، کھانسی، بخار نے چڑچڑاہٹ طاری کردی تھی۔ ہر وقت ریں، ریں کرتی اور کندھے سے جڑی رہتی...... خود عینی کی اپنی حالت شاید جاگ، جاگ کر بہت خراب ہوچکی تھی...... بیماری کی وجہ سے بچی بار، بار فیڈ مانگتی اور بار، بار دودھ پلانے کی وجہ سے کندھے پھوڑے کی طرح

دکھ رہے تھے...... کئی دفعہ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آیا...... اللہ نے مہربانی کی کہ گرتے، گرتے بچی...... جب بالکل ہی تھک کر بے دم ہوگئی تو ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کیا...... ڈاکٹر نے بچی کو خوب اچھی طرح چیک کیا...... انجیکشن لگایا، اینٹی بایوٹک سیرپ تجویز کیا...... نسخہ لکھتے، لکھتے ڈاکٹر نے ایک دم قلم روک کر پرے رکھ دیا اور عینی کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بی بی آپ نے خود اپنا چیک اپ کروایا ہے؟ آپ کی تو اپنی حالت قابلِ ترس ہے۔''

عینی کو ہمدردی میں ڈوبا یہ فقرہ بھی طنزیہ لگا...... اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے کونے گیلے ہوگئے، اس نے ہمت کرکے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، مجھے تھکاوٹ، نیند کی کمی ہے، بچے رات کو جگاتے ہیں، دن میں نیند پوری نہیں ہوتی۔''

''میرا خیال ہے آپ کسی لیڈی ڈاکٹر سے ٹریٹمنٹ لیں اور ضرور لیں، آپ کا رنگ کسی طرح بھی صحت مندوں والا نہیں ہے...... ہوسکے تو اپنا ایچ بی چیک کروائیں ضرور......'' بچی کی دوا کا نسخہ پکڑ کر وہ کلینک سے نکلی...... پتا نہیں کیوں دل میں آیا کہ اپنا چیک اپ کروالے...... کوئی ملٹی وٹامن، آئرن، کیلشیم ہی لکھ دے گی۔ لینے میں کیا حرج ہے؟ سامنے والی سڑک پر پڑے سے عائشہ اسپتال میں داخل ہوتے وقت اسے قطعی علم نہیں تھا کہ کون سی روح فرسا خبر اس کی منتظر ہے...... بچی کی پیدائش کے بعد اس نے حفظِ ماتقدم، احتیاطی بندوبست کیے ہوئے تھے گو کہ اس کے بعد مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا تاہم وہ مطمئن تھی۔ ایک دو سوال کرنے کے بعد ڈاکٹر نے آنکھیں بلکہ آنکھوں کے پپوٹے چیک کیے ایک دو ٹیسٹ لکھ کر دیے...... اور نیکسٹ کے لیے بیل بجادی......

تھکے، تھکے قدموں سے عینی نے اپنا بلڈ اور یورین لیبارٹری میں دیا...... بچی پرام میں سو رہی تھی...... شاید انجیکشن میں خواب آور دوا شامل تھی...... ڈاکٹر کے کمرے میں بند لفافے میں رپورٹ لے کر داخل ہوئی تو اتفاق سے مریضہ کے طور پر اب وہی تھی...... اس نے بغیر کہے رپورٹ ڈاکٹر کے آگے رکھ دی۔

''ہوں...... ہوں...... مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ پریگنینٹ ہیں۔'' ڈاکٹر نے رپورٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

زمین و آسمان یکجا ہوکر دھماکے سے الگ ہوگئے۔

''ک...... کیا......'' گھٹی، گھٹی آواز میں عینی نے کہا۔ آنسو بھل، بھل تیز رفتار چشمے کے پانی کی طرح آپوں آپ بہنے لگے۔

''ناٹ تھک ویک ہے...... آپ کو اصل میں بچی کی فیڈ بھی اب چھڑوا دینی چاہیے، فریش جوسز، مٹن، دودھ کا استعمال......'' عینی شاید بہری ہوگئی تھی...... اس کو ڈاکٹر کا کہا کوئی لفظ نہیں سنائی دے رہا تھا...... اگر سن بھی رہی تھی تو صرف ایک فقرہ...... ایک جملہ...... ''آپ پریگنیٹ ہوگئی ہیں۔''

''ابھی نہیں ڈاکٹر صاحب......'' بہت دیر کے بعد اس کے منہ سے فقرہ برآمد ہو...... ''بچے بہت چھوٹے ہیں میرے......''

وہ روئے جارہی تھی، روئے جارہی تھی۔ وہ نہ تو ناشکری تھی نہ ہی بچے سے انکاری...... بس ایک دے، دو دے، تین دے، چاہے ہر سال دے...... کہتے ہوئے یہ ذہن میں نہیں رہا تھا کہ آدم کو جنت میں بھی آدم ہی کہا جاتا تھا...... ترکِ اولیٰ ہوا ضعف کا شکار ہوگئے درخت کو ہاتھ لگا بیٹھے تو انسان کہلوائے، تھے تو آدم ہی......

آج عینی نے بھی آدمیت سے انسانیت کا سفر طے کرلیا تھا۔ اوپر فرشتے ایک دوسرے کو دیکھ کر کہہ رہے ہوں گے۔

''لو ایک اور...... انسان......''